# اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان

سیاسی و مذہبی قائدین و کارکنان کے لئے رہنما کتابچہ

ترتیب و تدوین

محمد اسرار مدنی

مجلس تحقیقات اسلامی

# اسلام، جمہوریت اور آئینِ پاکستان

سیاسی و مذہبی قائدین و کارکنان کے لیے رہنما کتابچہ

ترتیب و تدوین:

محمد اسرار مدنی

مجلس تحقیقات اسلامی

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب: **اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان**

مرتب: محمد اسرار مدنی

معاونین: محمد جان اخونزادہ، تحمید جان الازہری

ضخامت: 136 صفحات

ناشر: ادارہ امن تعلیم اسلام آباد

تعاون: مجلس تحقیقات اسلامی (IRCRA)

ایڈیشن: دوسرا ایڈیشن

**اسٹاکسٹ:**

(۱) مجلس تحقیقات اسلامی، پی او بکس نمبر 5 ،نوشہرہ کے پی کے۔

رابطہ نمبر: 0923-563445 email : ircra313@yaho.com

(۲) ادارہ امن و تعلیم اسلام آباد۔ فون نمبر 051-2351560

پی او بکس نمبر 1827 mail@pef-global.org

(۳) مکتبہ عمر فاروق، قصہ خوانی بازار پشاور (۴) مکتبہ امام اہل سنت گوجرانوالہ

(۵) اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن کراچی (۶) کتاب محل، اردو بازار لاہور

# انتساب

ان تمام اہل علم و دانش کے نام

جنہوں نے وطن عزیز میں

انتہا پسندی کے خلاف

**"آپریشن ضربِ فکر"**

میں حصہ لے کر پاکستانی قوم کو جگایا

# فہرست


| | |
|---|---|
| تقریظات وتاثرات از جید علمائے کرام، مذہبی قائدین ودانشورانِ ملت | 10 |
| عرض مرتب | 15 |
| **باب اول: جمہوریت اور جمہوری اقدار** | 18 |
| **فصل اول : جمہوریت** | 19 |
| مفہوم | 19 |
| جمہوریت کی اقسام | 19 |
| بلاواسطہ جمہوریت | 20 |
| بالواسطہ جمہوریت | 20 |
| **جمہوریت کی خوبیاں** | 21 |
| فلاح عامہ | 21 |
| عوام کی حکومت | 21 |
| اخلاقی بہبود | 22 |
| امن پسند | 22 |
| حب الوطنی | 22 |
| ہر دل عزیز | 23 |
| انسان دوستی | 23 |
| مساوات | 23 |

| | |
|---|---|
| انقلابات سے تحفظ | 23 |
| سیاسی شعور میں اضافہ | 24 |
| **فصل دوم: جمہوری اقدار اور اسلامی تعلیمات** | 25 |
| اجتماعی بھلائی | 25 |
| انصاف | 26 |
| آزادی | 27 |
| مقبول اور مکمل خود مختاری | 27 |
| زندگی کی اہمیت | 28 |
| مساوات | 28 |
| تنوع | 29 |
| خوشی کا حصول | 29 |
| حقیقت یا سچ | 30 |
| وطن کی محبت | 30 |
| قانون کی حکمرانی | 30 |
| **باب دوم: حکومت اور اس کے مختلف شعبہ جات** | 32 |
| حکومت کا مفہوم | 33 |
| حکومت کے شعبے | 33 |
| حکومت کی درجہ بندی | 34 |
| **باب سوم: اسلام اور جمہوریت** | 36 |

| | |
|---|---|
| **فصل اول: جمہوریت کا اسلامی تصور** | 37 |
| جمہوریت کا متبادل صرف آمریت | 37 |
| تشکیل حکومت میں عوامی رائے کی اہمیت | 38 |
| خلافت راشدہ میں کثرت رائے کی اہمیت | 39 |
| فقہا کی نظر میں کثرت رائے کی اہمیت | 41 |
| **فصل دوم : جمہوریت اور تکفیر** | 42 |
| فقہا کے نزدیک تکفیر کے بنیادی اصول | 42 |
| اسلامی قانون میں ایک احتمال تکفیر بھی مانع تکفیر ہے | 43 |
| **باب چہارم: جمہوریت کے متعلق مذہبی شبہات وخدشات اور ان کا ازالہ** | 47 |
| عوام حاکمیتِ یا اقتدارِ اعلیٰ کی بنیاد پر تکفیر | 48 |
| پہلا خدشہ: قرآن وسنت کی پابندی کے لئے کثرت رائے کی شرط | 48 |
| دوسرا خدشہ: آئین میں اکثریت کی رائے پر تبدیلی | 49 |
| تیسرا خدشہ: شرعی احکام پر حکومتی عمل درآمد قانون سازی کی محتاج | 50 |
| چوتھا خدشہ: قرآن کی رو سے اکثریت کی رائے پر فیصلہ گمراہی ہے | 52 |
| پانچواں خدشہ: جمہوریت میں اکثریت حق وباطل کی معیار ہے | 53 |
| چھٹا خدشہ: جمہوریت میں عالم وجاہل دونوں کا ووٹ برابر ہے | 54 |
| ساتواں خدشہ: مصور پاکستان علامہ اقبالؒ اور جمہوریت | 56 |
| آٹھواں خدشہ: جمہوریت میں بدعنوان لوگوں کے ووٹ پر اعتراض | 57 |
| نواں خدشہ: سربراہِ ریاست کے لیے قریشی ہونے کی شرط | 58 |

| | |
|---|---|
| دسواں خدشہ: جدید قومی ریاست اور جہاد | 61 |
| **باب پنجم: قومی اور بین الاقوامی قوانین کی شرعی حیثیت** | 64 |
| قانون وضعی کی حیثیت | 65 |
| پارلیمانی حکومت آمریت سے بہتر | 67 |
| بین الاقوامی قانون کی حیثیت | 69 |
| **باب ششم: آئینِ پاکستان کی شرعی حیثیت** | 72 |
| **فصل اول: کیا پاکستان کا آئین کفریہ ہے؟** | 73 |
| پاکستان دارالاسلام ہے | 73 |
| پاکستانی حکمرانوں اور عدالتوں کی شرعی حیثیت: جید علما کا فتویٰ | 75 |
| آئین پاکستان ایک صحیح، لازم اور نافذ معاہدہ | 78 |
| شریعت پر عمل عدالتی فیصلے سے مشروط نہیں | 78 |
| پارلیمنٹ کا قانون سازی کا اختیار مطلق نہیں | 79 |
| شرعی عدالت کے اختیار سماعت سے باہر قوانین شریعت سے بالاتر نہیں | 79 |
| پارلیمنٹ کو نظریاتی کونسل کی سفارشات ماننے کا پابند نہیں کیا جاسکتا | 80 |
| اسلامی نظریاتی کونسل اور شرعی عدالت صحیح سمت میں پیش رفت | 81 |
| آئینِ پاکستان اور پرامن انتقال اقتدار | 81 |
| عصر حاضر میں خروج کے نتائج | 82 |
| تعلیم و تربیت کے ذریعے ماہرین شریعت و قانون کی تیاری | 83 |

| | |
|---|---|
| **فصل دوم: پیغام پاکستان کے عنوان سے متفقہ فتوی** | 84 |
| متفقہ اعلامیہ | 84 |
| خلاصہ کلام | 91 |
| **فصل سوم: قرارداد مقاصد کا متن** | 93 |
| **فصل چہارم: قومی ریاست اور جہاد** | 95 |
| **باب ہفتم :آئین پاکستان پر معترضین کے شبہات کا تنقیدی جائزہ** | 101 |
| آئین پاکستان پر وارد کیے جانے والے شبہات کا خلاصہ | 102 |
| 1: آئین میں ارکان پارلیمان کو مطلق ترمیم کا حق | 103 |
| 2: خاتمۂ سود کے وعدے کا عدم ایفا | 104 |
| 3: صدر اور وزیر اعظم کا محاسبے سے استثناء | 105 |
| 4: سربراہی کے لیے مرد اور قاضی کے لیے اسلام اور عدالت کی شرط | 106 |
| 5: سربراہ مملکت کے لیے جرم کی معافی کا صوابدیدی اختیار | 107 |
| **باب ہشتم :اسلامی حکومت کے بنیادی اُصول** | 109 |
| ۱۹۵۱ء میں مکاتبِ فکر کے متفقہ نکات | |
| اسلامی مملکت کے بنیادی اصول۔ | 110 |
| اسمائے گرامی حضرات شرکائے مجلس | 114 |
| **باب نہم : ووٹ کی شرعی حیثیت** | 116 |
| ووٹ کی شرعی حیثیت | 117 |
| امیدوار | 118 |

| | |
|---|---|
| ووٹ اور ووٹر کی مختلف حیثیتیں | 119 |
| ووٹ کی پہلی حیثیت: شہادت | 119 |
| دوسری حیثیت: سفارش | 119 |
| تیسری حیثیت: وکالت | 120 |
| تنبیہ | 121 |
| خلاصہ بحث | 122 |
| **ضمیمہ: مکمل تقریظات وتاثرات** | 124 |
| مولانا سمیع الحق، مولانا فضل الرحمن، ڈاکٹر قبلہ ایاز، پروفیسر ساجد میر، علامہ ثاقب اکبر، حامد میر، مولانا زاہد الراشدی، مجیب الرحمان شامی، لیاقت بلوچ | 125 |
| فہرست مراجع | 147 |

## تقریظات وتاثرات(1)

## از جید علمائے کرام، مذہبی قائدین ودانشورانِ ملت

زیر نظر کتاب "اسلام، جمہوریت اور آئینِ پاکستان" میں بہت سے سلگتے سوالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، نیز آئین پاکستان کے حوالے سے بہت سے خدشات کا ازالہ بھی کیا گیا ہے۔

**مولانا سمیع الحق** صاحب، مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ،

امیر جمعیت علماءاسلام (س) پاکستان

کتاب ''اسلام ، جمہوریت اور آئین پاکستان''میں پاکستان کے جمہوری نظام اور دستور کے حوالے سے چند اہم سوالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور روایتی جذباتی اسلوب سے ہٹ کر علمی لہجے میں مدلل بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض مسائل میں قرآن و سنت اور فقہی و قانونی ذخیرے سے استدلال کیا گیا ہے، جس سے فکر و نظر کے نئے دریچے کھل جاتے ہیں ، گویا پاکستان اور اس کے آئین کو شریعت اسلامیہ اور عالمی تناظر میں سمجھانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ میں اس کاوش پر عزیزم محمد اسرار مدنی اور ان کے رفقاء کار مولانا تحمید جان وغیرہ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ مجلس تحقیقات اسلامی کی یہ کاوش آئین پاکستان، اور جمہوری نظام کے حوالے سے بہت سارے غلط فہمیوں کا ازالہ کرے گی اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حوالے سے جاری مثبت اور تعمیری مکالمے میں کردار ادا کریگا۔

**مولانا فضل الرحمن** ، صدر متحدہ مجلس عمل پاکستان

.....

نوٹ: مکمل تقریظات کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔

عرصہ دراز سے پاکستان کے جمہوری نظام کی بعض خامیوں کی وجہ سے نظم مملکت کے بارے میں متعدد سوالات اٹھنے کے بعد پاکستان، جمہوریت اور دستور پاکستان پر کچھ عناصر مذہبی بنیادوں پر متعدد اشکالات پیش کر رہے ہیں، زیر نظر کتاب میں ان سوالات کا انتہائی مدلل انداز میں جامع جواب فراہم کیا گیا ہے۔ نیز آئین پاکستان کے حوالے سے شبہات کا بہترین ازالہ کیا گیا ہے۔

**پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز**، چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

دنیا میں سیاسی حوالے سے آئینی حکومتوں کی تشکیل کے آغاز سے لے کر آج تک مسلمان معاشروں میں بعض ایسے گروہ موجود ہیں جو تاریخ کے کسی خاص موڑ پر کھڑے رہ گئے ہیں اور وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ انھوں نے آگے سفر نہیں کیا۔ یہ کتاب دراصل ایسے افراد کا ہاتھ پکڑ کر انھیں تاریخ کی موجودہ شاہراہ پر لانے کی ایک کوشش سے عبارت ہے۔

**علامہ ثاقب اکبر**، سربراہ البصیرہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

جناب اسرار مدنی صاحب نے مغربی نظریات کے افراد کو جھنجھوڑا ہے تو وہاں دین اسلام کے نام لیواؤں کو بھی اپنا ماضی یاد کرایا ہے تاکہ وہ اسکی روشنی میں مستقبل کی زلفیں سنوار سکیں۔ انہوں نے اسلام میں جمہوریت اور عام آدمی کی رائے کی اہمیت کو اجاگر کر کے بتایا ہے کہ ہر رائے قابل ہے، اچھی بات کی

قدر کرنا چاہیے اور اس پر عمل کر کے ہی فلاح دارین حاصل کی جاتی ہے، ہمیں توفی الدنیا حسنۃ فی الاخرۃ حسنہ کا سبق دیا گیا جسے ہم پڑھتے تو ہیں لیکن عمل پیرا نہیں ہوتے۔

**علامہ پیر اعجاز احمد ہاشمی**، صدر جمعیت علمائے پاکستان

مجلس تحقیقات اسلامی نے اس کتاب کے ذریعے بہت سے اعتراضات واشکالات کو دور کرنے کا سامان کیا ہے اور ان عناصر کے لیے جو پاکستان کے جمہوری نظام اور پاکستان کے آئین کو بنیاد بنا کر (دانستگی یا نادانستگی میں) "تکفیری ماحول" پیدا کر رہے ہیں' افہام و تفہیم اور اصلاح احوال کا وافر مواد فراہم کر دیا ہے۔

**سینیٹر پروفیسر علامہ ساجد میر**، امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان

اسلام اور جمہوریت کے موضوع پر بہت لکھا جا چکا ہے لیکن محترم محمد اسرار مدنی صاحب نے اسلام اور جمہوریت کے تعلق کو پاکستان کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

**حامد میر صاحب**، کالم نگار روزنامہ جنگ و اینکر جیو ٹی وی

اس پس منظر میں ریاست و حکومت کے مروجہ مفاہیم اور اسلامی حکومت و خلافت کے اصولوں، دائروں اور طریق کار کے بارے میں پیدا ہو جانے والے شکوک و شبہات کا ازالہ اور خلافت راشدہ کے اصولوں اور طریق کار کو اصلی شکل میں پیش کرنا اہل علم کی ذمہ داری اور مختلف ارباب فکر و دانش اس کیلئے مصروف عمل ہیں۔ ہمارے فاضل دوستوں جناب اسرار مدنی، تحمید جان اور ان کے رفقاء نے زیر نظر کتاب میں اسی کاوش کو آگے بڑھایا ہے اور متعلقہ امور و مسائل پر علمی و فکری انداز میں گفتگو کی ہے جو اس مسئلہ کو سمجھنے کیلئے کافی حد تک معاون ہو سکتی ہے۔

**ابو عمار زاہد الراشدی**، ڈائریکٹر الشریعۃ اکادمی گوجرانوالہ

اس کتاب میں ''حکومت عوام کے لئے'' یعنی رفاہ عامہ اور فلاح عامہ کے تناظر میں اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت کے مشترکہ اہداف کو اچھے انداز سے اجاگر کیا گیا ہے۔ پھر مروجہ مغربی لادین جمہوریت کی کلی تکفیر کی آڑ میں ،اسلام کے اندر جمہوری اقدار کی نفی کا بھی ایک اچھا محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ دستور پاکستان ،مقننہ اور اسلامی قوانین کی تیاری اور نفاذ کے متعدد اداروں کے حوالے سے پھیلائے گئے مغالطوں کو بھرپور طریقے سے رفع کیا گیا ہے۔ آخر میں پاکستان کے اندر اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے ،اب تک اٹھائے گئے تدریجی اقدامات کی تفصیلات بھی شامل کی گئی ہیں۔

**لیاقت بلوچ** ، قیم جماعت اسلامی پاکستان

مجلس تحقیقات اسلامی کی اس کاوش کی تعریف کی جانی چاہیے کہ اس نے جمہوری نظام اور پاکستان کے دستور کا ایک سنجیدہ جائزہ لینے کا اہتمام کیا ہے۔ زیر نظر کتاب کے کسی جز سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ آج کی پاکستانی سیاست اور صحافت کے مروجہ اسلوب سے حتی الامکان گریز کرتے ہوئے دلیل کے ساتھ بات کی گئی ہے۔ پڑھنے والوں کو اس سے بڑی رہنمائی ملے گی اور وہ اجتماعی عصری مسائل کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔

**مجیب الرحمان شامی**، چیف ایڈیٹر روزنامہ پاکستان، تجزیہ کار دنیا ٹی وی

# عرض مرتب

پاکستان میں جمہوریت کے حوالے سے طرح طرح کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ کوئی جمہوریت کو ملکی حالات کے تناظر میں پرکھتا ہے تو کوئی مذہب کے میزان میں تولتا ہے۔ کوئی اسے آمریت کے مقابلے میں کھڑا کرتا ہے تو کوئی خلافت کا متضاد سمجھتا ہے۔

ماضی قریب میں خطے کے نامساعد حالات میں یہ تمام صدائیں شدت سے بلند ہونے لگیں جس میں سب سے موثر نقطہ نظر بعض شدت پسند گروہوں کی طرف سے آنے لگا چونکہ اس موقف کے پیچھے بعض مذہبی دلائل تھے جس کی وجہ سے ہماری سوسائٹی اس حق وسچ سمجھنے لگی۔

راقم خود بھی ایک عرصے تک اسی نقطہ نظر کا حامی رہا، مگر مسلسل مکالمے، مطالعے اور مشاہدے کی بدولت اپنے موقف پر نظر ثانی کا موقع ملا اور نئے سفر کا آغاز کیا، لہذا پاکستان میں جمہوریت اور اس کے آئین کے خلاف لکھی جانے والی تمام کتابوں کو جمع کیا، پھر ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا، مطالعے کے بعد یہ صورتحال دلچسپ رہی کہ درجنوں کتابوں میں جمہوریت کے حوالے سے اٹھائے جانے والے شبہات واعتراضات میں بیشتر یکسانیت ہے۔

ان تمام سوالات واعتراضات کو یکجا کرنے کے بعد اسکا جوابی بیانیہ Counter Narrative تلاش کرنا شروع کیا۔ لہذا چند معاصر نامور اہل قلم کے ساتھ ساتھ قدیم اکابر کی کتابوں سے بہت کچھ اخذ کرنے کا موقع ملا۔ اور ان کی عبارات کو معمولی حک واضافے کے ساتھ شامل کیا گیا۔ ابتدائی طور پر کتاب کا نام اسلام، جمہوریت اور پاکستان تجویز کیا گیا مگر بعض احباب کی خواہش پر ''دستور'' کا اضافہ کیا گیا جبکہ بعض اکابر کی خواہش پر آخر میں ''اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان'' پر اتفاق کیا گیا۔

راقم ذاتی طور پر تمام اکابر ومشائخ اور دانشوران ملت کا مشکور و ممنون ہے جنہوں نے کتاب پر اپنی قیمتی آراء تحریر فرمائیں۔ خصوصاً برادرم محمد جان اخونزادہ، مولانا تحمید جان ازہری نے نظرثانی و ترتیب میں معاونت کی۔ نیز نامور صاحبانِ علم ودانش کا بھی مشکور ہوں جن کی تحریرات سے اس کتاب میں بھرپور استفادہ کیا گیا۔

اس کتاب کو زیور طبع سے آراستہ کرنے اور قارئین تک پہنچانے کے لئے ادارہ امن و تعلیم کے سربراہ سید اظہر حسین کا ممنون و مشکور ہوں۔ امید ہے یہ کتاب پاکستان کے جمہوری نظام اور آئین پاکستان کے حوالے سے غلط فہمیوں کا ازالہ کرے گی۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ یہ ایک طالب علمانہ کاوش ہے لہذا جہاں کہیں بھی کوئی عبارت قابل اصلاح ہو تو ضرور ہماری رہنمائی فرمائیں۔ میں ذاتی طور پر مشکور رہوں گا

**محمد اسرار مدنی**

مجلس تحقیقات اسلامی نوشہرہ

وأمرهم شورى بينهم

# باب اول

# جمہوریت اور جمہوری اقدار

فصل اول:

# جمہوریت

(Democracy)

## مفہوم

جمہوریت عربی زبان کا لفظ ہے جمہور کے معنی "عوام یا لوگ" کے ہیں۔ لہذا جمہوریت سے مراد عام لوگوں کی حکومت ہے۔ جمہوریت کے لیے انگریزی کا لفظ (Democracy) استعمال کیا جاتا ہے یہ لفظ دو یونانی الفاظ Demos اور Kratos سے اخذ کیا گیا ہے، جن کے بالترتیب معنی لوگ اور حکومت کے ہیں۔ اس طرح جمہوریت کا مطلب ہوا "عوام کی حکومت"۔ گویا یہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں عوام خود یا اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے حکومت کرتے ہیں۔ جمہوریت کی مختلف تعریفات کی رو سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایسی طرز حکومت ہے جس میں عوام کی اکثریت کی رائے کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ حکومت تمام افراد کے وسیع تر مفاد کی خاطر قائم کی جاتی ہے۔ اس میں عوام بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنے مسائل خود سلجھاتے ہیں اور ہر ایک کو قانونی مساوات حاصل ہوتی ہے۔

## جمہوریت کی اقسام

جمہوریت کی دو اقسام ہوتی ہیں:

۱۔ بلاواسطہ جمہوریت (Direct Democracy)

۲۔ بالواسطہ جمہوریت (Indirect Democracy)

### 1۔ بلاواسطہ جمہوریت (Direct Democracy)

بلاواسطہ جمہوریت میں عوام براہ راست امورِ حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ ایک جگہ اکٹھے ہو کر اپنے لیے قوانین بناتے اور سرکاری عہدے داروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ جمہوریت کی یہ قسم قدیم یونان اور روم میں رائج تھی۔ یہ ریاستیں رقبہ کے لحاظ سے بہت چھوٹی اور ان کی آبادی بھی بہت کم تھی۔ تھوڑی اور مختصر آبادی کا ایک جگہ جمع ہونا آسان تھا، اس لیے اس وقت ہر شہری کے لیے ممکن تھا کہ وہ براہِ راست نظم و نسق چلانے میں شریک ہو۔ درحقیقت بلاواسطہ جمہوریت ان چھوٹی ریاستوں ہی میں کامیاب تھی لیکن موجودہ بڑی اور وسیع ریاستوں میں یہ طریقہ قابل عمل نہیں ہے۔ آج کل ایسی جمہوریت کچھ حد تک سوئٹزرلینڈ میں پائی جاتی ہے۔

### 2۔ بالواسطہ جمہوریت (Indirect Democracy)

آج کل طویل و عریض ریاستوں میں بالواسطہ یا نمائندہ جمہوریت کا طریقہ رائج ہے۔ اس طرزِ حکومت میں تمام شہری ملکی معاملات میں براہِ راست حصہ نہیں لے سکتے بلکہ اپنے نمائندوں کے ذریعے کاروبارِ حکومت سرانجام دیتے ہیں۔ یہ جدید قسم کی جمہوریت ہے۔ جان سٹورٹ مل (John Stuart Mill) نے بالواسطہ جمہوریت کی یہ تعریف کی ہے:
"ایسا نظام حکومت جس میں تمام لوگ یا ان کی اکثریت اپنے منتخب نمائندوں کے توسط سے اپنے حاکمانہ اختیارات کا استعمال کرتے ہیں"۔

# جمہوریت کی خوبیاں

(Merits of Democracy)

جمہوریت نے دنیا کے قدیم بہت سے سیاسی نظاموں میں مؤثر تبدیلیاں لائیں،پرامن انتقال اقتدار سمیت کئی اہم امور کو جمہوریت کی خوبی میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں چند مختصر اور عمومی خوبیوں کا تذکرہ ہے، لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ جمہوریت میں کوئی خامی نہیں۔ لیکن جمہوریت میں پرامن تبدیلی اور خامیوں کو دور کرنے کی ہر وقت گنجائش موجود رہتی ہے۔

## فلاح عامہ

جمہوری حکومت دیگر حکومتوں کے مقابلے میں عام لوگوں کی فلاح وبہبود کا زیادہ خیال رکھتی ہے۔اس نظام میں کسی مراعات یافتہ طبقے کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایک طرح کی فلاحی مملکت (Welfare State)ہوتی ہے۔ جمہوریت عوام کو یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے حقوق سے بہتر طور پر فائدہ اٹھائیں اور اجتماعی خوشحالی سے ہمکنار ہوں۔ جمہوریت کی بدولت ہی زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

## عوام کی حکومت

جمہوریت ایک ایسی طرز حکومت ہے جس میں حکومت بنانے کا اختیار عوام کو حاصل ہوتا ہے ۔ عوام کے نمائندے ان کی مرضی کے مطابق حکومت چلاتے ہیں اور جو نمائندے منتخب ہوتے ہیں وہ انھی میں سے ہوتے ہیں۔ جمہوریت میں لوگوں کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ

حکومت ان کی بنائی ہوئی ہے، اس لیے ہر شخص اپنے فرائض ذمہ داری اور تندہی سے سرانجام دیتا ہے۔

## اخلاقی بہبود

جمہوریت عوام کے اخلاق کو بلند کرتی ہے۔ انھیں انسان دوستی، شرافت، باہمی ایثار اور محبت کے اصول سکھاتی ہے۔ اس لیے اس نظام کو اخلاقی افادیت کی بنا پر بھی پسند کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ بہتر حکومت وہ ہے جو فرد کی شخصیت کو فروغ دینے میں مددگار ہو۔ جمہوری حکومت اس کا بہتر انتظام کرتی ہے۔

## امن پسند

جمہوری نظام میں ملک گیری کی ہوس کم ہوتی ہے۔ اس میں حکومت امن پسند ہوتی ہے، کیونکہ یہ عوام کی مرضی پر انحصار کرتی ہے۔ عوام بخوبی جانتے ہیں کہ جنگ کی صورت میں وہ ہی سب سے زیادہ نقصان اٹھائیں گے۔ اگرچہ بعض اوقات بڑی طاقتیں ''امن پسند'' نہیں رہتی۔

## حب الوطنی

اس طرح کی حکومت میں عوام امورِ حکومت میں بذات خود حصہ لیتے ہیں اور عوام کی حکومت کے ساتھ وابستگی ہوتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حکومت اور ملک کے وہ خود مالک ہیں اور یہ احساس ان میں حب الوطنی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

## ہر دل عزیز

چونکہ یہ حکومت عوام کی مرضی کے مطابق چلتی ہے۔ حکومت عوام کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ قانون عوامی نمائندے وضع کرتے ہیں اور وہی نافذ کرتے ہیں۔ لہذا یہ طرز حکومت ہر دل عزیز قرار دیا جاتا ہے۔

## انسان دوستی

اکثر و بیش تر کسی آمر یا بادشاہ کی نظر میں انسانی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ وہ ہر جائز تنقید کرنے والے کو بھی کچل دیتا ہے، لیکن جمہوریت میں ایسا ممکن نہیں۔ وہ انسان دوستی کا بھرم رکھتی ہے اور ہر تنقید کو کھلے دل سے برداشت کرتی ہے۔

## مساوات

مساوات جمہوریت کا بنیادی ستون ہے۔ جمہوریت آزادی اور مساوات کی علم بردار ہوتی ہے۔ اس میں ہر شخص یکساں سیاسی حقوق کا مالک ہے۔ ہر شخص کو ترقی کے مساوی مواقع ملتے ہیں اور کسی کے ساتھ خصوصی اور امتیازی سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ عدالتیں شہریوں کے بنیادی حقوق کی محافظ ہوتی ہیں۔

## انقلاب سے تحفظ

جمہوریت میں بغاوت اور انقلاب کا خدشہ کم رہتا ہے، کیونکہ یہ پرامن ترغیب اور تحریک پر اعتقاد رکھتی ہے۔ عوام جانتے ہیں کہ اس نظام میں حکومت کو تبدیل کرنے کے لیے آئینی اور پرامن ذرائع موجود ہوتے ہیں، جس کا استعمال انتخاب کے موقع پر باآسانی کیا جاسکتا ہے۔ اس

لیے جمہوری حکومتیں اکثر انقلاب سے محفوظ رہتی ہیں۔بشرطیکہ ان حکومتوں میں حقیقی جمہوریت موجود ہو۔

## سیاسی شعور میں اضافہ

یہ نظام عوام میں سیاسی شعور اجاگر کرتا ہے ۔ اس طرزِ حکومت میں انتخابات کثرت اور باقاعدگی سے ہوتے ہیں۔انتخابات کے وقت ہر سیاسی جماعت ملکی مسائل اور ان کے حل کے لیے تجاویز پیش کرتی ہے، جس سے عوام کی سیاسی سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا ہے۔

جمہوری حکومتوں میں اگر مذکورہ صفات اور خوبیاں ہیں تو یہ صرف اس لئے کہ جمہوریت پر اس کی روح کے مطابق عمل کیا جائے۔اگر جمہوریت پر اس کی روح کے مطابق عمل نہیں ہوگا تو یہ ''فلاحی مملکت، عوامی حکومت بنانے اور انسان دوستی، ایثار و قربانی، امن پسندی، حب الوطنی اور مساوات کو فروغ دینے میں ناکام ہوتا ہے اور پے در پے انقلابات سے روبہ زوال ہوتا ہے۔

فصل دوم:

# جمہوری اقدار اور اسلامی تعلیمات

جمہوری اقدار جمہوری معاشرے کا انتہائی اہم حصہ ہے۔ دین اسلام نے جہاں انفرادی طور پر انسان کے لئے اخلاقی نظام تشکیل دیا ہے وہاں پر اجتماعی اور حکومتی سطح پر اقدار واخلاق اور حسن کردار کی تعلیم دی ہے ۔پیغمبر اسلام ﷺ نے آج سے کئی سو سال پہلے اپنی تعلیمات میں مسلمانوں کو ان اقدار کے اپنانے کا حکم فرمایا تھا۔ اس لئے موجودہ سیاسی سیٹ اپ میں اس کی اہمیت مزید بڑھتی جارہی ہے، لہذا چند اہم اقدار حسب ذیل ہیں:

## اجتماعی بھلائی

شہریوں کو مجموعی طور پر معاشرے کی بھلائی کے لیے کام کرنا چاہیے اور حکومت کو ایسے قوانین بنانا چاہیے جو سب کے لیے فائدہ مند ہوں۔ عوامی یا اجتماعی بھلائی کے لیے ضروری ہے کہ ہر شہری یہ عزم کرے کہ وہ اپنی قومی ذمہ داری پوری کرے گا۔ معاشرے کی فلاح و بہبود کو فروغ دینے اور تمام لوگوں کے مجموعی مفاد کے لیے معاشرے کے دیگر ارکان کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔ اسلامی تعلیمات میں بہت واضح طور پر انسانیت کی بھلائی پر زور دیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: خير الناس من ينفع الناس ( الحديث) لوگوں میں بہترین وہ ہے جو دوسرے لوگوں کو نفع دے۔

## انصاف

اپنے ملک اور رعایا میں سب کے ساتھ منصفانہ سلوک اختیار کرنا چاہیے، کسی گروہ یا شخص کو فوقیت نہیں دینی چاہیے۔ مراعات، حیثیت و مرتبہ، حقوق و فرائض اور فوائد کی تقسیم میں، معلومات کے اکٹھا کرنے اور فیصلہ سازی میں سب لوگوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جانا چاہیے۔ قانون کے تحت تمام شہریوں کو برابر اور منصفانہ سلوک کا حق حاصل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو حق دینے میں ہمیشہ انصاف سے کام لیا۔ ایک بار ارشاد فرمایا: ''تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب اُن میں سے کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اُسے چھوڑ دیتے تھے لیکن جب کوئی عام آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے تھے۔ اللہ کی قسم! محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا''۔ (صحیح بخاری و مسلم) یہ ہے انصاف کا وہ عالی قدر نمونہ کہ اگر مجرم اپنی اولاد بھی ہو تو اسے معاف نہ کیا جائے!

## آزادی

آزادی کے حق کو انسانی فطرت کے ایک ناقابل تبدیل پہلو کے طور پر مانا جاتا ہے۔ آزادی کا تصور یہ ہے کہ لوگ اپنے والدین یا آباؤاجداد کی سیاسی یا ذاتی ذمہ داریوں کے پابند نہیں ہیں اور نہ ہی لوگوں کو قانونی طور پر ان کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ آزادی کے حق میں **شخصی آزادی** بھی شامل ہے۔ اس میں لوگوں کے نجی دائرے شامل ہیں جس میں ہر شخص سوچنے، کام کرنے کے لیے آزاد ہے اور حکومت قانونی طور بھی ان میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ **سیاسی آزادی** ہے جس میں سیاسی عمل میں آزادانہ طور پر حصہ لینے، سرکاری حکام کو منتخب کرنے اور باہر نکالنے کا حق، قانون کی حکمرانی کے تحت حکومت کرنے کا حق، معلومات اور خیالات کے آزاد بہاو کا حق، بحث اور اجتماع کا حق شامل ہیں۔ **اقتصادی آزادی**: جس میں حکومتی مداخلت کے بغیر نجی

جائیداد حاصل کرنے، استعمال کرنے، منتقل اور تصرف کرنے کا حق، جہاں پر آپ راضی ہوں وہاں روزگار طلب کرنے کا حق، اپنی مرضی سے روزگار کو تبدیل کرنے اور کسی بھی قانونی معاشی سرگرمیوں میں مشغول ہونے کا حق شامل ہے۔ آزادی کا مطلب ہے کہ آپ جو چاہتے ہیں اس پر ایمان لانے کی آزادی ہو، آپ کو اپنے دوست منتخب کرنے کی آزادی ہو، آپ کو اپنے خیالات اور رائے رکھنے کی آزادی اور عوام میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی آزادی ہو، لوگوں کو ایک گروپ کی صورت میں اکٹھا ہونے کی آزادی ہو، اور کسی بھی جائز کام/روزگار یا کاروبار کی آزادی بھی شامل ہے۔

ہر چیز کے خالق، مالک، خوب قدرت و علم رکھنے والی ذات باری تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تاکہ وہ اس کے بندوں کو مخلوق سے آزادی دلائیں :قرآن مجید میں ہے:(حضرت موسیٰؑ نے یہ کہا) کہ اللہ کے بندوں (یعنی بنی اسرائیل) کو میرے حوالے کر دو تمھاری طرف (خدا کا) پیغمبر (ہو کر آیا) ہوں دیانت دار ہوں۔ کہنے لگے، "اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو، میں تمھاری طرف ایک امانت دار پیغمبر بن کر آیا ہوں "(سورۃ الدخان:18) یعنی خدا کے بندوں کو اپنا بندہ مت بناؤ۔ بنی اسرائیل کو غلامی سے آزادی دو اور میرے حوالہ کرو۔ میں جہاں چاہوں لے جاؤں۔

## مقبول اور مکمل خود مختاری

حکومت کی طاقت عوام سے آتی ہے۔ اس لیے عوام کی طاقت سے برسر اقتدار آنے والی حکومت زیادہ طاقتور اور خود مختار ہوتی ہے۔ جمہوریت میں اکثریت کی بنیاد پر حکومت بنتی ہے اور یہی اکثریت مفاد عامہ کے لیے قوانین بناتی ہے۔ امریکا کا صدر ہو یا ہمارے ملک کا وزیر اعظم، یہ تمام عوام کے ووٹ سے منتخب ہو کر آتے ہیں۔ اس لیے ایک جمہوری معاشرے میں "شہری" حکومت کی طاقت کا اہم ذریعہ ہیں۔

## زندگی کی اہمیت

ایک جمہوری معاشرے میں ہر شخص کو اس کا یا اس کی زندگی کے تحفظ کا حق حاصل ہے۔

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کا مشہور جملہ انسان کی آزادی کے حوالے سے ضرب المثل ہے فرمایا:

متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احرارا

''کب تک لوگوں کو غلام بناؤ گے حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد جنا ہے''

تمام شہری حکومت کی طرف سے یا کسی اور فرد یا گروہ کی جانب سے زخمی ہونے یا موت کے خوف کے بغیر جینے کا حق رکھتے ہیں۔ ریاست ہر شہری کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ دار ہے۔ اسلام میں کسی انسانی جان کی قدر و قیمت اور حرمت کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے بغیر کسی وجہ کے ایک فرد کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تکریم انسانیت کے حوالے سے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا: ''جس نے کسی شخص کو بغیر قصاص کے یا زمین میں فساد (پھیلانے کی سزا) کے (بغیر، ناحق) قتل کر دیا تو گویا اس نے (معاشرے کے) تمام لوگوں کو قتل کر ڈالا''۔ (المائدة ، 32)

## مساوات

جمہوریت میں سب افراد کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ آپ کے والدین یا آباؤ اجداد کہاں پیدا ہوئے تھے، آپ کی نسل، مذہب یا کتنی دولت آپ کے پاس ہے۔ سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر سب لوگوں کو مساوات حاصل ہے۔ ایک جمہوری ریاست میں تمام شہریوں کو **سیاسی مساوات** حاصل ہے اور تمام لوگ سیاسی معاملات میں حصہ لے سکتے

ہیں۔ **قانونی مساوات** کی رو سے قانون کی نظر میں سب شہری برابر ہیں۔ **سماجی مساوات** میں ہر قسم کی طبقاتی تقسیم ممنوع قرار دی گئی گئی۔ **معاشی مساوات** دیگر سیاسی اور سماجی مساوات کو مضبوط کرنے کے لیے از حد ضروری ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرمایا کہ: ''کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی کالے کو گورے اور گورے کو کالے پر سوائے تقوی کے''۔ (مسند احمد: ۲۳۵۳۶)

## تنوع

زبان، لباس، خوراک، جائے پیدائش، نسل اور مذہب میں اختلافات کی نہ صرف اجازت دی گئی، بلکہ اسے قبول بھی کر لیا گیا ہے۔ ثقافت، نسلی پس منظر، طرز زندگی، اور مذاہب میں رنگا رنگی اور تکثیریت نہ صرف جائز بلکہ ایک حقیقت بن چکی ہے۔ تکثیریت پر مبنی معاشرے میں ثقافت، لباس، زبان، مذہب وغیرہ میں فرق کو ایک طاقت کے طور پر مانا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھارے خاندان اور قومیں جو بنائی ہیں، تاکہ تمھیں آپس میں پہچان ہو (الحجرات: 13)

فقہ اسلامی میں فقہ الاقلیات کا بھرپور ذخیرہ موجود ہے جس کا مطلب ہے کہ ماضی میں اسلامی حکمرانوں کو ایک خاص انداز میں تکثریث کو قبول کیا تھا۔

## خوشی کا حصول

ہر شخص اپنے طریقے سے خوشی حاصل کر سکتا ہے جب تک کہ وہ دوسروں کے حقوق پامال نہ کرے۔ آپ دوسروں کے حقوق اور معاملات کو پامال کیے بغیر اپنے طریقے سے خوشی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ جو خوشی دوسروں کے لیے وبال جان ہو اس کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالی کا

ارشاد ہے: فَرِحِيْنَ بِمَا اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (آل عمران: 170) کہ جنتی لوگ خوش ہوں گے؛ان نعمتوں پر جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کیا ہے۔ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً بِسَاعَةٍ کہ دلوں کو وقتاً فوقتاً خوش کرتے رہا کرو۔(مسند الشہاب القضاعی، حدیث نمبر 672) اسی وجہ سے پڑوسی کو تکلیف دینے کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے،دیگر اور شرعی احکام بھی اس پر شاہد عمل ہیں

## حقیقت یا سچ

شہری حکومت سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ تمام معلومات کو ظاہر کرے اور حقائق کا مکمل انکشاف کرے یعنی جھوٹ سے اور حقائق چھپانے سے گریز کرے، عوام اور حکومت کے درمیان اعتماد سازی ایک جمہوری حکومت کا لازمی جزو ہے، جھوٹ اور معلومات کو پوشیدہ رکھنا اسلام اور جمہوری یا سیاسی اقدار کے خلاف ہے۔حضور اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''عبداللہؓ بن مسعودؓ فرماتے تھے کہ سچائی کو اختیار کرو، کیونکہ سچائی خدا کی وفاداری کی راہ پر لے جاتی ہے اور خدا کی وفاداری جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور جھوٹ سے بچو، کیونکہ جھوٹ خدا کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور خدا کی نافرمانی دوزخ کی طرف رہنمائی کرتی ہے(صحیح البخاری: 6094)۔

## وطن کی محبت

قول و عمل میں میں اپنے ملک سے اور جمہوری اقدار سے محبت کا ہونا لازمی ہے۔اپنے ملک، اپنی اقدار، اور اصولوں سے محبت اور عقیدت کا اظہار حب الوطنی ہے۔ کھیلوں کی تقریب کے آغاز میں قومی ترانے کے دوران کھڑے ہونا حب الوطنی دکھانے کا ایک طریقہ ہے۔حب الوطنی کے حوالے سے بہت سی اسلامی تعلیمات موجود ہیں مگر اس روایت سے اسلام اور

پیغمبر پاکؐ کے حب الوطنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔جب آپ ﷺ نے مدینہ کو اپنا وطن و مسکن بنالیا تو چونکہ آپ ﷺ کی مکہ مکرمہ سے فطری و جبلی محبت تھی،اس لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کی:''اے پروردگار! مدینہ کو ہمارے نزدیک محبوب بنادے۔ جس طرح ہم مکہ سے محبت کرتے ہیں،بلکہ اس سے بھی زیادہ محبت پیدا فرما۔'' (البخاری: 1889)

## قانون کی حکمرانی

حکومت اور عوام دونوں کے لیے قانون پر عمل کرنا ضروری ہے۔ قانون کی حکمرانی جمہوری اقدار کے تحفظ کے لیے اہم ہے۔ارشاد باری تعالی ہے: وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (البقرة: 229)"اور جو لوگ اللہ کی حدود سے باہر نکل جائیں گے،وہ گناہ گار ہوں گے"۔اسی وجہ سے فقہانے ایک عمومی قاعدہ وضع کیا کہ جن معاملات میں اللہ تعالیٰ کی معصیت لازم نہ آتی ہو،ان میں حکومتِ وقت کے حکم کو ماننا فرض ہے۔(فتاویٰ شامی، 422/5)

باب دوم

# حکومت اور اس کے مختلف شعبہ جات

# حکومت

(Government)

## حکومت کا مفہوم

حکومت کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک تعریف کے مطابق: "حکومت سیاسی کنٹرول کاایسا نظام ہے جس کے تحت قانون بنانے اور نافذ کرنے کا حق آزاد سیاسی معاشرے میں مخصوص افراد کو ہوتا ہے"۔ اسی طرح دوسری تعریف کے مطابق: ''حکومت جمہوری ریاست میں منتخب افراد کی ایسی تنظیم ہے، جو آئین کے مطابق عوام کی اجتماعی ترقی کے لیے پالیسی کو نافذ کرتی ہے''۔ مثلاً برطانیہ میں پارلیمانی حکومت۔ ایک اور جگہ کہا گیا ہے کہ: "حکومت سے مراد ایسا اقتدار اعلیٰ ہے جو ایک ریاست میں یاایک آزاد سیاسی معاشرے میں ایک یا چند منتخب افراد کی طرف سے برتر سیاسی حیثیت میں استعمال کیا جاتا ہے اور حکومت کا یہ اعلیٰ اختیار آئین کے مطابق عوام کا عطا کردہ ہوتا ہے جو کہ معاشرہ میں رعایا کی حیثیت رکھتے ہیں"۔

جدید دور میں حکومت کے معاشرتی اور معاشی فرائض میں اضافہ ہوا ہے۔ فرد کی تعمیر سیرت، معاشرتی عدل کا قیام، عوام کے معاشی تحفظ اور فلاح و بہبود جیسے مقاصد کو بہتر طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کو تین شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

## حکومت کے شعبے (Organs of Government)

ابتداً حکومت کی تنظیم تین شعبوں پر مشتمل ہوتی تھی مگر اب مرور زمانہ کے ساتھ چار ستون پر مشتمل ہے۔

1- **مقنّنہ:** مُہذب معاشرے کی ترقی کے لیے قوانین بناتی ہے جو ریاست میں بہتر زندگی بسر کرنے کے لیے نظام حیات کا تعین کرتے ہیں۔

2- **انتظامیہ:** ان قوانین کو نافذ کرتی ہے تاکہ لوگوں کو پرامن پرسکون ذہنی روحانی اور جسمانی خوشی حاصل ہو۔

3- **عدلیہ:** ملک میں عدل وانصاف قائم کرتی ہے۔ شہریوں کو آزادی اور بنیادی حقوق کا تحفظ فراہم کرتی ہے۔

4- **میڈیا:** شعور وآگہی اور بنیادی مسائل کو اجاگر کرنا، مگر تاحال یہ حکومت کے چوتھے ستون بننے میں ناکام ہے۔

## حکومت کی درجہ بندی (Classification of Government)

دورِ قدیم سے دور جدید تک حکومت کی اقسام کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے۔ علم سیاسیات کے بعض مفکرین جن میں ارسطو (Aristotle) بھی شامل ہے، حکومت کی اقسام کو ریاست کی قسمیں قرار دیتے ہیں، لیکن ماہرین سیاست اس کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے، حقیقت تو یہ ہے کہ ریاست کی درجہ بندی ممکن نہیں، کیونکہ دنیا کی تمام ریاستیں نوعیت اور عناصر کے لحاظ سے ایک جیسی ہوتی ہیں۔

ہر ریاست چار لازمی عناصر یعنی آبادی، علاقہ، حکومت اور اقتدار اعلیٰ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کی تمام ریاستیں ایک جیسی ہیں۔ البتہ حکومت کی مختلف قسمیں ہوسکتی ہیں۔ آج بھی بعض ممالک میں جمہوریت ہے اور بعض میں آمریت، کسی ملک میں پارلیمانی نظام حکومت ہے تو کسی ملک میں صدارتی طرز حکومت ہے۔ کئی ممتاز مفکرین نے حکومت کی مختلف تقسیمات کو بیان

کیاہے، لیکن ان میں سے ڈاکٹر لیکاک کی تقسیم (Dr. Leacock's Classification) سب سے بہتر اور جامع سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک خاکہ کی صورت میں درج ہے:

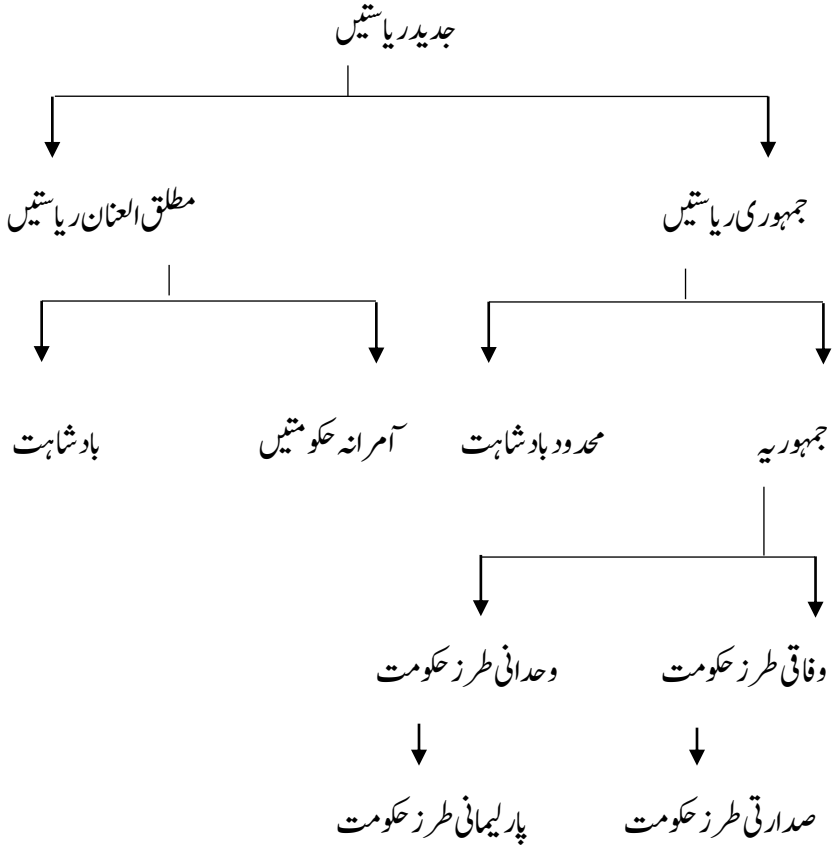

باب سوم

# اسلام اور جمہوریت

فصل اول:

# جمہوریت کا اسلامی تصور

جمہوریت کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ عوام کے اجتماعی معاملات کو چلانے کے لیے عوام کی اکثریت کی رائے پر عمل کیا جائے۔ یہ نہ صرف انتہائی فطری اور واحد قابل عمل طریقہ ہے بلکہ دین کے تقاضوں کے بھی عین مطابق ہے۔ قرآن کا حکم أمرُهم شُورىٰ بينهم [1] اسی کا بیان ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ مسلمانوں کے معاملات ان کے مشورے/رائے سے چلائے جانے چاہئیں۔ اس حکم کا تقاضا محض یہ نہیں ہے کہ ان سے رسمی طور پر مشورہ کر لیا جائے بلکہ ان کے مشورہ کے مطابق ہی فیصلہ بھی کیا جائے، اور یہ مشورہ بھی کسی خاص طبقے یا گروہ تک محدود نہ ہو بلکہ تمام لوگوں کو مشورے/رائے کا یکساں حق دیا جائے، اسی کا نام جمہوریت ہے۔ اسلام نے أمرُهم شُورىٰ بينهم کا ایک واضح اصول دیا ہے جس میں حکمرانوں کا انتخاب اور معزول ہونا اور باقی اجتماعی معاملات بھی لوگوں کی مرضی سے طے کیے جاتے ہیں۔ خلافت راشدہؓ کے انتخاب میں بھی یہی اصول کارفرما رہا اور تمام خلفائے راشدینؓ اصلاً لوگوں کی مرضی سے ہی حکمران بنے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی اپنی نامزدگی کے باوجود لوگوں کی آزاد مرضی کے بعد ہی اس ذمہ داری کو قبول کیا تھا۔

## جمہوریت کا متبادل صرف آمریت

جمہوریت کا متبادل صرف اور صرف آمریت ہے۔ یعنی محض طاقت کے بل بوتے پر عوام کے حق حکمرانی کو غصب کر لینا۔ اگر اس اصول کو مان لیا جائے تو جس طرح آج خلافت کے نام پر مدعی اقلیت میں ہونے کے باوجود طاقت اور جبر کی بنیاد پر اپنا غلبہ حق

[1] الشوریٰ:۳۸

بجانب سمجھتے ہیں، اسی طرح کل کوئی مغرب زدہ یا کمیونسٹ اقلیت یا کسی اقلیتی مسلک کے ماننے والے بھی اگر طاقت حاصل کر لیتے ہیں تو کیا آپ انھیں یہ حق دینے کے لیے تیار ہیں کہ وہ بالجبر آپ پر مسلط ہو جائیں۔ طاقت کے قانون کے اس اصول کو اگر مان لیا جائے تو اس کا نتیجہ مستقل انتشار اور انارکی کے سوا اور کیا نکل سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں واپس عوامی رائے کی طرف آنا ہوگا۔

## تشکیلِ حکومت میں عوامی رائے کی اہمیت

حکومت کے انعقاد میں عوامی رائے اور استصواب کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ درج ذیل تاریخی روایت سے ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے انتخاب میں عوامی رائے معلوم کرنے میں کس قدر محنت اور جان فشانی سے کام لیا:

"پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ان دونوں (حضرت عثمانؓ و حضرت علیؓ) کے متعلق لوگوں سے مشورہ کرنے میں مشغول ہو گئے۔ آپ اکابر سے بھی مشورہ کرتے اور ان کے پیروکاروں سے بھی۔ اجتماعاً بھی اور متفرق طور پر بھی، اکیلے اکیلے سے بھی اور دو دو سے بھی، خفیہ بھی اور علانیہ بھی، حتیٰ کہ پردہ نشین عورتوں سے بھی مشورہ کیا۔ مدرسے کے طالب علموں سے بھی، اور مدینہ کی طرف آنے والے سواروں سے بھی، بدوؤں سے بھی جنھیں وہ مناسب سمجھتے۔ تین دن اور تین راتیں یہ مشورہ جاری رہا۔ آپ نے دو آدمیوں کے سوا سب لوگوں کو حضرت عثمانؓ کی خلافت کے حق میں پایا، البتہ حضرت عمارؓ اور مقدادؓ نے حضرت علیؓ کے حق میں مشورہ دیا۔ بعد میں ان دونوں نے بھی (حضرت عثمانؓ) کی دوسرے لوگوں کے ساتھ بیعت کی جیسا کہ ہم ابھی بیان کریں گے۔ سو حضرت عبدالرحمٰنؓ ان تین دن اور تین راتوں میں بہت کم سوئے۔ وہ اکثر نماز، دعا، استخارہ اور ان لوگوں سے مشورہ

میں وقت گزارتے تھے جن کو وہ مشورہ کا اہل سمجھتے۔ سو آپ نے (اس مشورہ کے دوران) کسی کو بھی نہ پایا جو حضرت عثمانؓ کے برابر کسی کو سمجھتا ہو۔" (البدایۃ والنہایۃ، ج ۷، ص ۱۴۷) اس روایت کے مطابق بچوں اور خواتین سے بھی رائے لی گئی جبکہ آج کی جمہوریت میں اٹھارہ سال کی شرط لازمی ہے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی بنیاد پر ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کے مشورے کے بغیر مسلمانوں کے نظم اجتماعی کا قیام اور بقا ناممکن ہے۔ آپ نے فرمایا: لا خلافة إلا عن المشورة. خلافت کا قیام اور انعقاد مشورے کے بغیر جائز نہیں۔

## خلافت راشدہؓ میں کثرتِ رائے کی اہمیت:

جمہوریت میں اکثریت کی رائے کے مطابق سربراہ ریاست کا تعین ہوتا ہے۔ کثرتِ رائے کے ساتھ انتظامی اور بعض اوقات شرعی معاملات کا فیصلہ قرنِ اول میں بھی رائج تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سامنے جب کوئی نیا معاملہ آتا تو وہ اس کو قرآن و حدیث میں تلاش کرتے، وہاں نہ ملتا تو صحابہ کرامؓ سے ان کے گھر جاکر ملاقات کرتے اور اس میں بھی کامیاب نہ ہوتے تو اصحاب رائے صحابہ کو جمع کرکے ان کے سامنے مسئلہ رکھتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی معمول تھا، عام طور پر قرآن و حدیث کے سامنے آجانے کے بعد اتفاق رائے ہو جاتا، لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ قرآن و حدیث کی طرف مراجعت میں، خِفا یا ظاہری تعارض کے سبب یا امور انتظامیہ میں اختلاف رائے کے باعث اتفاق نہ ہو سکا، تو کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا۔

خلافت راشدہ کے پورے عہد میں ایک نظیر بھی اسی طرح کی پیش نہیں کی جاسکتی کہ امیر المومنین نے محض اپنی رائے کو یا اقلیت کی رائے کو یہ کہہ کر نافذ کیا ہو کہ ایسا کرنا ان کے اختیار میں داخل ہے، البتہ اس طرح کے متعدد واقعات ملیں گے کہ امیر المومنین اپنی مدلل اور مضبوط رائے

کو نافذ کرنے سے محض اس لیے رکے کہ اکثریت ان کے حق میں نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی خلافت کا انعقاد بھی شوریٰ اور کثرتِ رائے کی بنیاد پر ہوا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ سقیفۂ بنو ساعدہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب بھی بھاری اکثریت نے کیا ہے، بنو ہاشم کے خواص اور انصار کے شیخ قبیلہ حضرت سعد بن معاذؓ کی رائے اس وقت ان کے حق میں نہیں تھی۔[2]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشورہ کیا تو مشورہ کی خصوصی مجلس میں اختلاف ہو گیا، پھر جب آپ نے رائے عامہ معلوم کی تو وہ بالاتفاق حضرت عمرؓ کے حق میں گئی اس لیے یہ انتخاب بھی شوریٰ اور کثرت رائے سے ہوا۔[3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے جو چھ اراکین پر مبنی مجلس شوریٰ نامزد کی تھی، اس نے بھی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ رائے عامہ کی کثرت دیکھ کر کیا ہے۔ (تاریخ اسلام اکبر شاہ) اور اسی رائے عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی ہے۔ خلافت راشدہ میں عددی کثرت کے فیصلہ کن ہونے کی سب سے عمدہ وضاحت حضرت عمر کی نامزد کردہ مجلس شوریٰ کی تفصیلات سے ہوئی ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان حضرات کو یہ ہدایت کی تھی کہ اگر اتفاق رائے سے انتخاب عمل میں آجائے تو سب سے اچھی بات ہے اور اگر اختلاف رائے ہو جائے تو اکثریت کے مطابق انتخاب کیا جائے اور اقلیت اگر فیصلہ کے خلاف بغاوت کرے تو اس کو عبرتناک سزا دی جائے۔ خلافت راشدہ میں عام طور پر مسائل کے حل کے لیے

---

[2] (تاریخ اسلام اکبر شاہ، ج1، نیز دیکھیے: الفاروق)

[3] نظام حکومت، ص 324

مجلس شوریٰ نے کتاب وسنت کی طرف مراجعت کی ہے اور جب کوئی مسئلہ صاف ہو گیا ہے تو عام طور پر اتفاق رائے ہو گیا ہے اور اگر اختلاف باقی رہا ہے تو کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا ہے۔

## فقہاء کرام کی نظر میں کثرتِ رائے کی اہمیت:

کثرتِ رائے بعد میں آنے والے فقہا کے ہاں بھی حجتِ شرعیہ کے طور پر موجود ہے۔ اگر کسی مسئلہ میں فقہا کا اختلاف رائے ہو تو وہاں کثرت رائے کی بنیاد پر ترجیح کا اصول موجود ہے۔ کثرتِ رائے کی بنیاد پر ترجیح کی بات دو موقعوں پر کہی گئی۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ائمہ احناف سے کوئی قول منقول نہیں ہے، اور فقہائے متاخرین کے ہاں بھی اس مسئلہ میں اختلاف رائے ہو جائے، تو اس سلسلہ میں اکثریت کے قول پر عمل کیا جائے گا۔[4]

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسئلہ میں دو قول ہیں اور دونوں ہی کو صحیح قرار دیا گیا ہے، ان دونوں صحیح اقوال میں سے ایک قول کو ترجیح دینے کے سلسلے میں کثرتِ رائے کے اصول کو مان لیا گیا ہے، یعنی اس صورت میں جس قول کو زیادہ لوگوں نے اختیار کیا ہو، وہی معتبر ہو گا۔[5]

غرض یہ ہے کہ کثرت رائے کے وجہ ترجیح یا شرعاً معتبر ہونے کے لیے قرآن کریم احادیث پاک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل، خلفائے راشدین کا عمل اور فقہائے کرام کی تصریحات سب ہی موجود ہیں، اس لیے اگر شوریٰ میں اختلاف رائے ہو جائے تو ایسی صورت میں اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے میں شرعاً کوئی تنگی نہیں ہے، اور اگر اکثریت پر فیصلے کی بات باہمی معاہدہ یا دستور اساسی کی صورت میں طے کر لی گئی ہو تو پھر صرف اکثریت ہی کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ضروری ہو جائے گا۔

---

[4] (دیکھیے: شرح عقود رسم المفتی، ص-78)

[5] (شرح عقود رسم المفتی ص-89)

فصل دوم:

# جمہوریت اور تکفیر

آج کے دور میں کسی سیاسی یا قانونی تصور پر بحث کرتے وقت تکفیر کی بحث چھیڑ دی جاتی ہے، گزشتہ کئی عرصہ سے جمہوریت کے ساتھ تکفیر کا ایک ایسا لاحقہ مل گیا ہے جو اب زبان زدِ عام و خاص ہے، بدقسمتی سے پاکستان میں بھی یہی لاحقہ مقبول ہوتا جارہا ہے، لہٰذا پاکستان میں جمہوریت کو کفر قرار دینے سے قبل ہمیں اسلامی قوانین میں تکفیر کے اصول و ضوابط کو دیکھنا پڑے گا۔

## فقہاء کے نزدیک تکفیر کے بنیادی اصول

فقہا کا بیان کردہ تکفیر کا سب سے بنیادی اصول یہ ہے کہ کوئی بھی قول، چاہے وہ بظاہر کفریہ ہی کیوں نہ دکھائی دیتا ہو، اگر وہ ایک سے زیادہ مفاہیم کا احتمال رکھتا ہو اور ان میں سے کوئی ایک ضعیف احتمال بھی ایسا ہو جو اسے کفر کے دائرے سے نکال دیتا ہو تو اسے اسی مفہوم پر اس سے مشابہ محمول کیا جائے گا یہاں تک کہ قائل خود یہ وضاحت نہ کر دے کہ اس کی مراد کفریہ مفہوم ہی ہے۔ فقہ حنفی کی معروف کتاب المحیط البرہانی میں ہے:

> يجب أن يعلم أنه إذا كان في المسئلة وجوه توجِب التكفيرَ ووجهًا واحدًا يمنع التكفير، فعلى المفتي أن يميل إلى الوجه الذي يمنع التكفير تحسينًا للظن بالمسلم، ثم إن كان نية العامل الوجه الذي يمنع التكفير فهو مسلم، وإن كانت نيته الوجه الذي يوجب التكفير لا ينفعه فتوى المفتي ويؤمر بالتوبة والرجوع عن ذلك وبتجديد النكاح بينه وبين امرأته [6]

[6] (المحيط البرهاني في الفقه النعماني، ج-5، ص-550)

"یہ جاننا لازم ہے کہ اگر کسی مسئلے میں ایک سے زیادہ احتمالات تکفیر کا تقاضا کرتے ہوں، جبکہ صرف ایک احتمال تکفیر سے مانع ہو تو مفتی پر لازم ہے کہ وہ مسلمان کے ساتھ حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اسی احتمال کو اختیار کرے جو تکفیر سے مانع ہے۔ پھر اگر اس عمل کا ارتکاب کرنے والے کی نیت وہی احتمال ہو جو تکفیر سے مانع ہے تو وہ مسلمان شمار ہوگا، لیکن اگر خود اس کی نیت وہ احتمال ہو جو تکفیر کا موجب ہے تو ایسی صورت میں اسے مفتی کا فتویٰ کوئی فائدہ نہیں دے گا اور اسے کہا جائے گا کہ وہ توبہ کرکے اس عمل سے رجوع کرے اور اپنی بیوی کے ساتھ نکاح کی تجدید کرے"۔

## اسلامی قانون میں ایک احتمال تکفیر بھی مانع تکفیر ہے

بعینہ یہی بات مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن النُجیم بھی دہراتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

إذا كان في المسالة وجوهٌ تُوجِبُ التكفيرَ ووجهٌ واحدٌ يمنعُ التكفيرَ فعلى المُفتي أن يَمِيلَ إلى الوجه الذي يمنعُ التَكفيرَ تحسينًا للظن بالمسلم.[7]

"اگر کسی مسئلے میں کئی احتمال ایسے ہوں جو تکفیر کو واجب کرتے ہوں اور صرف ایک احتمال تکفیر سے مانع ہو تو مفتی کا فرض ہے کہ وہ مسلمان کے ساتھ حسن ظن کی بنیاد پر اس وجہ کو اختیار کرے جو تکفیر سے مانع ہو"۔

المحیط البرھاني میں اس اصول کے انطباق کی ایک عمدہ مثال بھی نقل کی گئی ہے:

المسلمون إذا أخذوا أسيرًا وخافوا أن يُسلِم فكعموه أي سدُّوا فمَه بشيءٍ حتّى لايُسلم، أو ضربوه حَتّى يشتغلَ بالضربِ فلا يسلم، فقد أساءوا في ذلک، ولم يقل فقد كفروا... وذكر شيخ الإسلام رحمه الله في شرح السير: أن الرضا بكفر الغير إنما

[7] (البحر الرائق،1345)

يكون كفرا إذا كان يستجيز الكفر لمن كان شريرا موذيا بطبعه حتى ينتقم الله منه، فهذا لايكون كفرًا [8]

"مسلمان اگر (جنگ میں) کسی قیدی کو گرفتار کریں اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ (زبان سے) اسلام کا اقرار نہ کرلے، اس کے منہ کو کسی چیز سے بند کردیں یا اسے مارنا شروع کردیں تاکہ وہ مار سے بدحواس ہوجائے اور قبول اسلام کا اعلان نہ کرپائے تو ایسا کرنے والوں نے غلط کام کیا، لیکن اس سے وہ کافر نہیں ہوجائیں گے۔ شیخ الاسلام نے شرح السیر میں واضح کیا ہے کہ دوسرے کے کفر پر راضی ہونا صرف اس صورت میں کفر ہے جب ایسا کرنے والا کفر کو اچھا اور جائز سمجھتا ہو، لیکن اگر وہ کفر کو نہ تو جائز سمجھتا ہو اور نہ اسے پسند کرتا ہو، بلکہ صرف یہ چاہتا ہو کہ ایک شریر اور طبعًا موذی کافر، کفر پر ہی مرے یا اسے قتل کردیا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ اس سے (ان اذیتوں کا جو اس نے مسلمانوں کو دیں) انتقام لے تو اس نیت سے ایسا کرنے والا کافر نہیں ہوگا"

مذکورہ مثال میں کچھ مسلمان ایک کافر کو کلمہ پڑھنے سے روکنا چاہتے ہیں، جس کا مطلب بظاہر یہ بنتا ہے کہ وہ اس کو کافر ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے اسلام قبول کرنے پر راضی نہیں۔ اب ظاہر کے اعتبار سے کسی کے کفر پر راضی ہونا اور اسے قبول اسلام سے روکنا کفر ہے۔ لیکن فقہا یہ قرار دے رہے ہیں کہ یہاں چونکہ اسلام سے روکنے والوں کی نیت فی نفسہ کفر کو پسند کرنا اور اسے جائز سمجھنا نہیں، بلکہ وہ اس نیت سے ایسا کررہے ہیں کہ ایک موذی اور شر پسند دشمن اللہ کے انتقام سے بچنے نہ پائے، اس لیے ان کے اس عمل کو ان کی نیت کا اعتبار کرتے ہوئے کفر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

[8] (المحيط البرهاني في الفقه النعماني، ج-5، ص-551)

علمائے کلام نے کسی قول یا عمل کے کفر ہونے کی ایک واضح نشانی یہ بتائی ہے کہ جس قول یا عمل کو کفر کہا جارہا ہے، اس کا کفر ہونا ایسا واضح ہو کہ مسلمان بالاجماع اسے کفر قرار دینے میں کوئی تردُّد محسوس نہ کریں۔ قاضی ابو بکر باقلانی لکھتے ہیں:

ولا يُكَفَّر بقولٍ ولا رأيٍ إلا إذا أجمعَ المسلمون على أنه لا يوجَد إلا من كافرٍ، ويقومُ دليلٌ على ذلك فيكفر [9]

کسی بات یا رائے پر اس وقت تک تکفیر نہ کی جائے جب تک مسلمانوں کا اس پر اجماع نہ ہو کہ وہ بات کسی کافر ہی سے صادر ہو سکتی ہے اور اس پر دلیل قائم ہو جائے، تب اسے کفر قرار دیا جائے گا۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ کسی استنباطی یا اجتہادی شرعی مسئلے کے انکار کی بنیاد پر، چاہے اس پر فقہا کا اجماع ہی کیوں نہ ہو، کسی کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ تکفیر کے لیے ضروری ہے کہ آدمی نے قطعی، واضح اور غیر محتمل نص سے ثابت شریعت کے کسی اصولی اور اساسی حکم کا انکار کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل ایوب خان کے دور میں جو عائلی قوانین منظور کیے گئے، اس کی بہت سی شقیں متفق علیہ شرعی احکام کے منافی تھیں، لیکن چونکہ وہ دین کے اصولی نہیں، بلکہ فروعی مسائل تھے اور قطعی طور پر منصوص نہیں بلکہ استنباطی تھے، اس لیے اس وقت سے آج تک کسی بھی ذمہ دار عالم یا مفتی نے اس پر کفر کا فتویٰ صادر نہیں کیا۔

ایک عام فرد کی تکفیر میں بھی ان اصولوں کی رعایت ضروری ہے، جبکہ معاملہ اگر ایک پورے نظام ریاست اور اس کے آئین کا ہو جس کی ترتیب وتدوین میں وقت کے جید ترین اور اکابر علما شریک رہے ہوں اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ اس آئین کو ایک اسلامی آئین قرار دے رہے

[9] (فتاوى السُبكي، 578/2)

ہوں، تو اس آئین کی کسی دفعہ سے کفر اخذ کرتے ہوئے مذکورہ اصولوں کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ لہذا ریاست کے کسی آئین کی ایک شق یا کسی عمل کو کفر سمجھ کر پوری ریاستی نظام کی تکفیر اسلام کے خلاف ہے۔

باب چہارم

# جمہوریت کے متعلق مذہبی شبہات وخدشات کاازالہ

## حاکمیتِ عوام یا اقتدارِ اعلیٰ کی بنیاد پر تکفیر

جمہوریت کو "حاکمیت عوام " کے نظریے کی بنیاد پر کفریہ نظام قرار دینے اور حاکمیتِ عوام کو اس کا لازمی جُزو قرار دینے والے گروہ کی طرف سے ایک اعتراض یہ اٹھایا جاتا ہے کہ جمہوریت میں اگر آئینی طور پر قرآن وسنت کی پابندی قبول کی جاتی ہے، تو اس لیے نہیں کی جاتی کہ وہ خدا کا حکم ہے جس کی اطاعت لازم ہے، بلکہ اس اصول پر کی جاتی ہے کہ یہ اکثریت نے خود اپنے اوپر عائد کی ہے اور وہ جب چاہے، اس پابندی کو ختم کر سکتی ہے۔ اس لیے آئین میں اس کی تصریح کے باوجود جمہوریت درحقیقت ''حاکمیت عوام'' ہی کے فلسفے پر مبنی نظام ہے۔ اس استدلال کے دو نکتے ہیں اور ہم ان دونوں نکتوں کا جواب الگ سے تحریر کرتے ہیں:

### ا: پہلا خدشہ: قرآن وسنت کی پابندی کے لئے کثرت رائے کی شرط

آئین میں قرآن وسنت کی پابندی دراصل قرآن وسنت کے واجب الاتباع ہونے کے عقیدے کے تحت نہیں، بلکہ محض اسلئے قبول کی جاتی ہے کہ اکثریت یہ پابندی قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔

**جواب:** سوال یہ ہے کہ اگر آئین میں اس تصریح کا مطلب یہ نہیں کہ آئین ساز اسمبلی خود کو قرآن وسنت کا پابند سمجھتی ہے اور یہ محض حاکمیتِ عوام کے اصول کا ایک اظہار ہے، تو اس مقصد کے لیے اسمبلی کو یہ تصریح کرنے کی آخر ضرورت اور مجبوری ہی کیا در پیش ہے؟ پھر تو آئین میں سادہ طور پر صرف یہ بات لکھنی چاہیے کہ قانون سازی کا مدار اکثریت کی رائے پر ہے اور اس بنیاد پر جو بھی قانون بنے گا، وہ اس وقت تک قانون رہے گا جب تک اسے اکثریت کی تائید حاصل رہے۔ جب آئین ساز اسمبلی اس سے آگے بڑھ کر باقاعدہ ایک اصول کے طور پر یہ نکتہ آئین میں شامل کر رہی ہے کہ مقننہ قرآن وسنت کے احکام کی پابند ہو گی تو کس اصول کی رو سے اس پر یہ الزام عائد کیا جا

سکتا ہے کہ وہ قرآن وسنت کی پابندی کو بالذات اور مستقل اصول کے طور پر قبول نہیں کر رہے ہیں۔

## ۲: آئین میں اکثریت کی رائے پر تبدیلی

چونکہ آئین میں اکثریت کی رائے کی بنیاد پر تبدیلی کی جاسکتی ہے اور اس اصول کے تحت اگر کسی وقت اکثریت قرآن وسنت کی پابندی کی شرط کو ختم کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنت کی پابندی کو فی نفسہ اور بالذات نہیں، بلکہ محض اکثریت کی رائے کی بنیاد پر قبول کیا جارہا ہے۔

**جواب:** سوال یہ ہے کہ دین وشریعت بلکہ دنیا کے کسی بھی قانون یا ضابطے کی پابندی قبول کرنے کا آخر وہ کون سا اسلوب یا پیرایہ ہو سکتا ہے جس میں یہ امکان موجود نہ ہو کہ کل کو پابندی قبول کرنے والا اس کا منکر نہیں ہو جائے گا؟ مثال کے طور پر ایک شخص کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرتا ہے، تو اسے اس بنیاد پر مسلمان تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی مرضی اور آزادی سے یہ فیصلہ کیا ہے، حالانکہ اس بات کا پورا امکان ہے کہ وہ کسی بھی وقت اسی آزادی کی بنیاد پر اسلام سے منحرف ہونے کا فیصلہ کر لے۔ اب کیا اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ چونکہ کل کو وہ اپنی مرضی سے اسلام کو چھوڑ سکتا ہے، اس لیے آج اس کے کلمہ پڑھنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ وہ اسلام کو فی نفسہ واجب الاتباع نہیں سمجھتا، بلکہ اپنی ذاتی پسند اور مرضی کی وجہ سے قبول کر رہا ہے؟ دنیا کے ہر معاہدے اور ہر ضابطے کی پابندی کی بنیاد اسی آزادی پر ہوتی ہے جو انسانوں کو حاصل ہے اور جو آج کسی پابندی کے حق میں اور کل اس کے خلاف بھی استعمال ہو سکتی ہے، لیکن ہم اس آزادی کے منفی استعمال کے بالفعل ظہور پذیر ہونے سے پہلے کبھی مستقبل کے امکانی مفروضوں کی بنیاد پر حال میں یہ قرار

نہیں دیتے کہ فلاں شخص یا گروہ در حقیقت اس قانون یا ضابطے کو فی حد ذاتہ واجب الاتباع ہی تسلیم نہیں کرتا۔

## ۳: شرعی احکام پر حکومتی عمل درآمد قانون سازی کا محتاج ہے:

جمہوریت میں شریعت کے واضح اور مسلمہ احکام بھی کسی ملک میں اس وقت تک قانون کا درجہ اختیار نہیں کر سکتے، جب تک کہ منتخب قانون ساز ادارہ اسے بطور قانون منظور نہ کر لے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمہوریت میں اللہ کی شریعت کا نفاذ انسانوں کی منظوری کا محتاج ہے، اگر وہ بطور قانون اسکی منظوری نہ دیں تو کوئی حکم شرعی نافذ نہیں ہو سکتا اور ظاہر ہے کہ یہ ایک کفریہ تصور ہے۔

**جواب:** اس دلیل میں جو منطقی مغالطہ ہے اسے ایک مثال کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کریں ایک شخص کسی کو قتل کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں شریعت کا واضح اور قطعی حکم ہے کہ قاتل کو مقتول کے قصاص میں قتل کیا جائے۔ لیکن شریعت کا یہ حکم اس وقت تک عملاً نافذ نہیں ہو سکتا جب تک یہ مقدمہ باقاعدہ کسی بااختیار عدالت کے سامنے پیش نہ کیا جائے اور عدالت یہ فیصلہ نہ سنادے کہ قاتل کو قصاص میں قتل کیا جائے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ شریعت کا حکم اپنے نفاذ کے لیے ایک جج کی منظوری کا محتاج ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اس لیے کہ شریعت کے حکم اور اس پر عمل درآمد کے درمیان عدالت کا کردار اس تصور کے تحت نہیں رکھا گیا کہ خدا کی شریعت انسانی تائید کی محتاج ہے، بلکہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس حکم کے نفاذ کے عمل کو منضبط اور غلطیوں سے محفوظ بنایا جا سکے۔ بالکل یہی معاملہ کسی شرعی حکم کو قانون سازی کے مرحلے سے گزارنے کا ہے۔ جب آئین میں اصولی طور پر یہ مان لیا گیا کہ شریعت بالادست قانون ہو گی، تو تمام واضح اور قطعی احکام اصولاً قانون کا درجہ اختیار کر گئے۔ اس کے بعد ان احکام کے حوالے سے قانون سازی کے

مراحل بنیادی طور پر پروسیجرل (procedural) ہیں نہ کہ اس بنیاد پر کہ احکام شرعیہ کو ابھی قانون بننے کے لیے منظوری کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ خاص طور پر ملحوظ رہنا چاہیے کہ شریعت کا کوئی بھی واضح اور صریح حکم اس وقت تک نفاذ میں نہیں آسکتا جب تک اس کے ساتھ جڑے ہوئے چند اجتہادی سوالوں کا جواب نہ دے دیا جائے۔ مثلاً چوری کو لیجیے۔ محض یہ تسلیم کر لینے سے کہ چور کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، کسی بھی چوری کے مقدمے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ حکم کے اطلاق کے لیے شاید درجنوں اجتہادی سوالات کا جواب دینا پڑے گا اور اس کے لیے کسی نہ کسی اجتہادی تعبیر کو قانون کا درجہ دینا پڑے گا۔ مثلاً یہ کہ چوری کا مصداق کیا ہے؟ کتنے مال کی چوری پر یہ سزا لاگو ہو گی؟ کیا ہر طرح کے حالات میں یہ سزا دی جائے گی یا کچھ مخصوص حالات میں رعایت بھی دی جا سکتی ہے؟ ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اجتہادی سوالات ہیں جو نص میں صراحتاً مذکور نہیں اور ان کا جواب طے کیے بغیر کسی ایک مقدمے کا فیصلہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ہر واضح اور قطعی شرعی حکم نفاذ کے لیے ایک اجتہادی تعبیر کا محتاج ہے۔ قانون سازی دراصل اسی درمیانی مرحلے کو طے کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ قانون کے بنیادی پہلوؤں کی ایک متعین تعبیر کے بغیر، جس کی روشنی میں عدالتیں فیصلے کر سکیں، قانون کے نفاذ میں بہت سی پیچیدگیاں اور مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جدید سیاسی نظام میں قانون ساز ادارے اس نوعیت کی پیچیدگیوں کو کم کرنے اور قانون کے بنیادی پہلوؤں کو واضح اور متعین کرنے کے کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر قانون کے بنیادی خطوط اور حدودِ اربعہ متعین نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ قانون کی براہ راست تعبیر کا کام عدالتوں کو کرنا پڑے گا جس میں اختلافات کا پیدا ہونا اور اس کے نتیجے میں قانونی سطح پر پیچیدگیوں کا سامنے آنا ناگزیر ہے۔ علمی اور نظری سطح پر کسی قانون کی تعبیر میں اختلافات ہوں تو

ان سے عملی پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتیں، لیکن قانونی نظام کی سطح پر بہر حال ایک بنیادی نوعیت کی یکسانی پیدا کرنا انتظامی پہلو سے ایک مجبوری کا درجہ رکھتا ہے۔

جمہوریت میں شرعی احکام کو نفاذ سے پہلے قانون ساز ادارے کی منظوری کے مرحلے سے گزارنا دراصل اسی پہلو سے ضروری ہوتا ہے، نہ کہ اس مفروضہ تصور کے تحت کہ شریعت کا حکم تب واجب العمل ہوگا جب انسان اسے قانون کے طور پر منظور کر لیں گے۔ چنانچہ صورت حال کی درست تعبیر یہ ہوگی کہ آئین کی اسلامی نوعیت طے ہو جانے کے بعد تمام احکام شریعت کی پابندی قبول کر لی گئی، البتہ انھیں قانون کی سطح پر نافذ کرنے کے لیے کچھ درمیانی مراحل طے کرنا ضروری تھا جن میں سب سے اہم مرحلہ قانون کی تعبیر کا تھا۔

## ۴: قرآن کی رو سے اکثریت کی رائے پر فیصلہ گمراہی ہے۔

جمہوریت کو خلاف اسلام سمجھنے والے قرآن کی چند آیات سے استدلال کرتے ہیں، جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اکثریت کی پیروی نہ کرو کیونکہ اکثریت گمراہ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ایک آیت یہ ہے:

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ١ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ[10]

"اور اکثر لوگ جو زمین پر آباد ہیں (گمراہ ہیں) اگر تم ان کا کہنا مان لوگے تو وہ تمھیں خدا کا رستہ بھلا دیں گے۔ یہ محض خیال کے پیچھے چلتے اور نرے اٹکل کے تیر چلاتے ہیں"۔

[10] (الانعام ٦:١١٦)

**جواب:** اس آیت اور اس مفہوم کی دوسری آیات سے واضح ہے کہ یہاں ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو رسول کے منکرین ہیں اور جانتے بوجھتے رسول کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں۔ رسولوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے لوگ عموماً اکثریت میں رہے ہیں اور رسولوں پر ایک قلیل تعداد ہی ایمان لاتی ہے۔ رسولوں اور ان کے ماننے والوں کو منکرین اور معاندین کی اس اکثریت کی پیروی سے منع کیا جارہا ہے۔ اس بات کا اس سے کیا تعلق ہے کہ جب رسول کے ماننے والے ایک معاشرہ منظّم کر لیں تو اب کے معاملات ان ہی کی اکثریت کی رائے سے چلائے جائیں۔

## ۵: جمہوریت میں اکثریت حق و باطل کی معیار ہے:

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اکثریت کی رائے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اکثریت حق و باطل کا معیار بن گئی ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ اکثریت کی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔ صحیح اور غلط کا معیار تو صرف دلیل ہے۔ اکثریت کی رائے تو اصل میں فصلِ نزاعات کا ایک طریقہ ہے۔ بلکہ صحیح تر الفاظ میں واحد قابل عمل اور دوسرے تمام ممکنہ طریقوں کے مقابلے میں سب سے بہتر اور کم نقصان دہ طریقہ ہے۔ اگر فیصلہ سازوں کے درمیان رائے کا اختلاف ہو جائے تو فیصلہ کرنے کا اس کے سوا کیا مہذب راستہ باقی بچتا ہے کہ اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کر لیا جائے۔ اس کے سوا تمام طریقوں کا انجام انتشار اور انارکی ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فرض کیجیے فیصلہ سازوں کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کسی تعلیمی ادارے میں مخلوط تعلیم کا انتظام کیا جائے یا لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ انتظام کیا جائے۔ فیصلہ ساز دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ قلیل گروہ کی رائے یہ ہے کہ دین کی تعلیمات کسی صورت مخلوط نظام کی اجازت نہیں دیتیں۔ کثیر گروہ کی رائے میں دین ہی کی تعلیمات کی روشنی میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ شائستگی اور وقار کے ساتھ حدود کے اندر رہتے ہوئے مخلوط نظام کو قبول کیا

جاسکتا ہے۔اب قطع نظر اس سے کہ صحیح رائے کس گروہ کی ہے، فیصلہ کی فطری بنیاد اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کر لیا جائے۔ یہ کسی صورت باطل کی پیروی نہیں ہے۔اس طریقے میں یہ امکان بہر حال موجود ہے کہ غلط فیصلہ عمل میں آجائے۔ لیکن ساتھ ہی یہ راستہ بھی کھلا ہے کہ قلیل گروہ دلائل سے کثیر گروہ کو اپنی رائے کے حق میں قائل کر لے اور فیصلہ اس رائے کے حق میں تبدیل ہو جائے۔

غلط فیصلہ ہو جانے کا امکان اگر کوئی نقص ہے تو یہ نقص مفروضہ 'خلافت' کے نظام میں بھی بعینہٖ موجود ہے۔ خلیفہ یا اس کی شوریٰ پر وحی تو نازل ہو گی نہیں۔ تمام تر تقویٰ اور تدین کے باوجود وہ بہر حال انسان ہی ہوں گے، جن سے ہر وقت خطا کا وقوع ممکن ہے۔ یہ خطا فیصلوں میں بھی ممکن ہے اور بالکل اسی طرح ممکن ہے جس طرح جمہوریت میں۔ سیدنا عمرؓ نے ایک موقع پر مہر کی تحدید کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن ایک خاتون کے توجہ دلانے پر آپ نے اس فیصلہ کو غلط مانتے ہوئے واپس لے لیا۔ بہت ممکن تھا کہ بعد میں کسی دوسرے فرد کے توجہ دلانے پر یا خود ہی اپنی رائے تبدیل ہو جانے پر سیدنا عمرؓ پھر پہلی رائے کے قائل ہو جاتے۔ کیونکہ یہ رائے تو بہر حال موجود ہے کہ حکمران مخصوص حالات میں مہر کی تحدید کا اختیار رکھتا ہے۔ مختصراً یہ کہ جب 'خلافت' کے نظام میں بھی غلط فیصلے ہو سکتے ہیں اور ان کی اصلاح کے لیے کوئی انتظام بنانا پڑ سکتا ہے تو یہی انتظام 'جمہوریت' میں بھی ہو سکتا ہے۔

## ۶: جمہوریت میں عالم و جاہل دونوں کا ووٹ برابر ہے:

جمہوریت کا ایک اور نقص یہ بتایا جاتا ہے کہ اس میں ہر ایک فرد حکومتی سربراہ کے انتخاب میں اپنا ووٹ استعمال کر سکتا ہے۔ یہ ایک انتہائی غیر فطری، غیر منصفانہ اور بیہودہ طریقہ ہے۔آخر ایک جاہل، گنوار، غیر متقی فرد کی رائے ایک عالم، متقی، ذہین اور قابل فرد کی رائے کے برابر کیسے ہو سکتی ہے؟

**جواب:** ہماری رائے میں یہ نقطہ نظر بھی مغالطوں پر مبنی ہے۔ شریعت اور فقہ دونوں کی نظر میں قانونی طور پر ہر مسلمان برابر ہے۔ اللہ کی نظر میں اور آخرت میں اجر کے لحاظ سے لوگوں کے درجات جو بھی ہوں، قانونی حقوق و فرائض کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ لہٰذا سب کا ووٹ/مشورہ/رائے بھی برابر ہے۔ قرآن مجید کے حکم اِمرہم شوریٰ بینہم کا لازمی تقاضا ہے کہ جن لوگوں کے معاملات ہوں ان سب کی رائے فیصلہ میں شامل ہو۔ مثلاً اگر پاکستان کا حکمران بنانے کا معاملہ کروڑ لوگوں سے متعلق ہے تو لازماً 20 کروڑ لوگوں کی رائے سے ہی فیصلہ کیا جانا چاہیے۔ آخر کسی محدود طبقے یا گروہ کو یہ حق کیسے اور کس اصول کے تحت دیا جائے کہ وہ ان بیس کروڑ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ خود کردیں؟ یہ یقینی طور پر اِمرُہم شُوریٰ بینہم کے اصول کی خلاف ورزی ہوگی۔ اور فرض کریں آپ یہ حق، مثال کے طور پر، علما کے طبقے کو دیتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ محض اپنی رائے سے کریں تو یہ اعتراض پھر اٹھتا ہے کہ علما بھی عمر، علم، تقویٰ اور اہلیت کے لحاظ سے مختلف درجوں کے ہوں گے تو ان سب کی رائے یا ووٹ کیوں برابر ہو؟ ایک عالم آج درس نظامی کی تکمیل کرکے فارغ ہوا ہے اور دوسرا عالم سال پہلے عالم بنا تھا اور تخصص کرکے آج شیخ القرآن، شیخ الحدیث یا مفتی کے درجے پر فائز ہے۔ ان دونوں کو رائے یا ووٹ کا یکساں حق کس اصول کی بنیاد پر دیا جائے؟ اسی طرح ایک ڈاکٹر آج ڈاکٹر بنا ہے اور دوسرا سال کا تجربہ رکھنے والا اسپیشلسٹ ہے۔ ان دونوں کو رائے یا ووٹ کا یکساں حق کیوں دیا جائے؟ علیٰ ھذا القیاس۔ الغرض یہ کہ آپ ووٹ دینے کے لیے جو بھی تحدید کر دیں آپ کو بہر حال ووٹ کے حقدار طبقے یا گروہ کے معاملے میں یہ سمجھوتہ کرنا پڑے گا کہ بلا لحاظ علم، تقویٰ و تدین، تجربہ اور مہارت اس طبقہ کے ہر فرد کا ووٹ برابر تسلیم کریں۔ تو آخر یہ سمجھوتہ بیس کروڑ عوام کے بارے میں کرنے میں کیا قباحت ہے جبکہ معاملات بھی تمام کے تمام عوام سے متعلق ہوں۔

## ۷: مصورِ پاکستان علامہ اقبالؒ جمہوریت کے مخالف ہیں:

نظریۂ پاکستان کے بانی علامہ محمد اقبال کے کئی اشعار جمہوریت کی مخالفت میں ہیں۔اس لیے پاکستان میں جمہوریت کی ترویج اور پرچار خود نظریۂ پاکستان کے بانی کے نظریات کے مخالف ہے۔

**جواب:** جمہوریت کے خلاف علامہ اقبالؒ کے اشعار تو بہت دہرائے جاتے ہیں۔آیئے تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھتے ہیں۔

علامہ اقبال اپنے خطبات "تشکیل جدید فکریات اسلام" (The Reconstruction of religious thoughts in Islam) میں فرماتے ہیں:

" گزشتہ پانچ سو برس سے اسلامی فکر عملی طور پر ساکت و جامد چلی آ رہی ہے۔ ایک وقت تھا جب مغربی فکر اسلامی دنیا سے روشنی اور تحریک پاتا تھا۔ تاریخ کا یہ عجب طرفہ تماشہ ہے کہ اب دنیائے اسلام ذہنی طور پر نہایت تیزی سے مغرب کی طرف بڑھ رہی ہے، گو یہ بات اتنی معیوب نہیں کیونکہ جہاں تک یورپی ثقافت کے فکری پہلو کا تعلق ہے، یہ اسلام ہی کے چند نہایت اہم ثقافتی پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ ڈر ہے تو صرف یہ کہ یورپی ثقافت کی ظاہری چمک کہیں ہماری اس پیش قدمی میں حارج نہ ہو جائے اور ہم اس ثقافت کی اصل روح تک رسائی میں ناکام نہ ہو جائیں۔ ہماری ذہنی غفلت کی ان کئی صدیوں میں یورپ نے ان اہم مسائل پر سنجیدگی سے سوچا ہے، جن سے مسلمان فلاسفہ اور سائنس دانوں کو گہری دلچسپی رہی تھی"۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"اہل سنت کے قوانین (فقہ) کی رو سے امام یا خلیفہ کا تقرر ناگزیر ہے۔اس سلسلے میں جو پہلا سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا خلافت فرد واحد تک محدود رہنی چاہیے، ترکوں کے اجتہاد کی رو سے یہ اسلام کی روح کے بالکل مطابق ہے کہ خلافت یا امامت افراد کی ایک جماعت یا منتخب اسمبلی کو سونپ دی جائے، جہاں تک میں جانتا ہوں مصر اور ہندوستان کے علما اسلام اس مسئلے پر ابھی تک خاموش ہیں۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ ترکوں کا موقف بالکل درست ہے اور اس کے بارے میں بحث کی بہت کم گنجائش ہے۔ **جمہوری طرز حکومت نہ صرف یہ کہ اسلام کی روح کے عین مطابق ہے، بلکہ یہ عالم اسلام میں ابھرنے والی نئی طاقتوں کے لحاظ سے بہت ضروری ہے"۔**

"آج کے مسلمان کو چاہیے کہ اپنی اس اہمیت کو سمجھیں، بنیادی اصولوں کی روشنی میں اپنی عمرانی زندگی کی از سر نو تشکیل کریں اور اسلام کے اس مقصد حقیقی کو حاصل کریں، جس کی تفصیلات تاحال ہم پر پوری طرح واضح نہیں ہیں، یعنی روحانی جمہوریت (Spiritual Democracy) کا قیام"۔

## ۸: جمہوریت میں بدعنوان لوگوں کے ووٹ پر اعتراض اور علامہ اقبال کا نقطۂ نظر:

جمہوریت پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ہمارے عوام کی اکثریت بدعنوان، بدکردار اور کم علم لوگوں پر مشتمل ہے لہٰذا وہ اپنے ہی جیسے لوگوں کو منتخب کریں گے۔ یہ تو بہر حال حقیقت ہے کہ جیسا معاشرہ ہوتا ہے عموماً ویسے ہی اس کے حکمران ہوتے ہیں، اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ غیر فطری اور مصنوعی طریقہ سے طاقت کے زور پر کسی دین دار فرد کو 'خلیفہ' بنا دیا جائے۔ایسا

حکمران یا تو معاشرے کی طرف سے مسترد کر دیا جائے گا یا معاشرے جیسا ہی بن جائے گا۔ صحیح اور فطری طریقہ صرف یہ ہے کہ معاشرے کے اخلاق و کردار کی تربیت کی جائے، جس حد تک معاشرہ بہتر ہو گا اسی کے بقدر اجتماعی نظام بھی بہتر ہوتا جائے گا۔ یہی بات علامہ اقبال اپنے خطبات میں ان الفاظ میں کہتے ہیں:

"جدید مسلم اسمبلی کی قانونی کارکردگی کے بارے میں ایک اور سوال بھی پوچھا جاسکتا ہے۔ کم از کم موجودہ صورتحال میں اسمبلی کے زیادہ تر ممبران مسلم فقہ (قانون) کی باریکیوں کے بارے میں مناسب علم نہیں رکھتے۔ ایسی اسمبلی قانون کی تعبیرات میں کوئی بہت بڑی غلطی کر سکتی ہے۔ قانون کی تشریح و تعبیر میں ہونے والی ان غلطیوں کے امکانات کو ہم کس طرح ختم یا کم سے کم کر سکتے ہیں۔ غلطیوں سے پاک تعبیرات کے امکانات کی واحد صورت یہ ہے کہ مسلمان ممالک موجودہ تعلیم قانون کے نظام کو بہتر بنائیں، اس میں وسعت پیدا کریں اور اس کو جدید فلسفہ قانون کے گہرے مطالعے کے ساتھ وابستہ رکھا جائے"۔

## ۹: سربراہِ ریاست کے لیے قریشی ہونے کی شرط:

اسلام میں سربراہِ ریاست کے لیے قریشی ہونا شرط ہے اور اس شرط پر فقہائے اسلام کا اتفاق ہے، جبکہ جمہوریت میں ہر کوئی ریاست کا سربراہ بن سکتا ہے، چاہے وہ قریشی ہو یا غیر قریشی۔

**جواب:** بہت سے لوگوں نے حدیث الأئمة من قريش اور اجماعِ صحابہؓ واہل کلام سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کا سربراہ قریش کے علاوہ اور کوئی نہیں بن سکتا۔ مگر اکابر علم دین اور فقہ کے محققین پر مخفی نہیں کہ خود حضرت عمرؓ سے ایسی قابل اعتماد روایتیں منقول

ہیں (جن کو امام احمدؒ نے مسند میں ذکر فرمایا ہے)، جو حضرت معاذؓ بن جبلؓ اور سالمؓ مولی حذیفہ جیسے غیر قریشیوں کے لیے حکومت کی سربراہی کا استحقاق ظاہر کرتی ہیں۔ اس سے حضرات صحابۂ کرامؓ کے اجماع کی قطعیت میں تردد پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ائمۂ علم کلام میں امام ابوبکر باقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ جیسے جلیل القدر اشعری متکلم نے بھی اس مسئلے میں اختلاف کیا ہے، جس کی وجہ سے اہل کلام کے اجماع میں بھی تردد پیدا ہوا۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں صحابہؓ کا اس حدیث کو قبول کر لینا اس اجماع پر قطعی دلیل نہیں ہو سکتا کہ قریشیت خلافت کی ایسی شرط ہے جس کے بغیر شرعی خلافت ممکن ہی نہیں۔

اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آخری زمانہ میں خلیفہ ہونا اور قحطانی کا بادشاہ ہونا صحیح احادیث میں مروی ہے۔ قحطانی کی بادشاہت ہی پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا ہے اور حدیث قریش سے اس کو رد کرنا چاہا ہے، مگر علمائے حدیث اور ائمہ اہل سنت اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

اس حدیث پر غور کر لینے کے بعد اس کے دو مفہوم سامنے آتے ہیں۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے خبر دی ہے کہ آئندہ جو لوگ خلیفہ بنیں گے، وہ قریش سے ہوں گے۔ اس صورت میں حدیث کا منشا یہ ہوگا کہ قریش امامت و خلافت کے زیادہ مستحق ہیں، کیونکہ اس وقت تمام عرب صرف قریش کو اس منصب کے لیے مناسب سمجھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں: عرب سربراہی کا استحقاق قریش کے علاوہ دوسروں میں نہیں جانیں گے۔ (مصنف عبد الرزاق، 231/5) خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

الملک في قریش والقضاء في الأنصار والأذان في الحبشة والأمانة في الأزد

حکومت قریش میں اور قضا انصار میں اور اذان حبشہ میں اور امانت ازد میں ہے۔

(الترمذی، حدیث نمبر:3871)

یہاں پر یہ ضروری ہے کہ جس طرح قضا کا استحقاق انصار کے لیے اور اذان کا استحقاق حبشہ کے لیے ثابت کیا جاتا ہے اسی طرح قریش کے لیے امامت وخلافت کے استحقاق کا اقرار کیا جائے۔ اس سے دوسروں کے حقِ خلافت وامامت کا انکار ثابت نہیں ہوتا، جیسے کہ انصار کے علاوہ دوسروں کی قضا کا انکار نہیں، اس لیےّملا علی قاری فرماتے ہیں:

أقول وفيه إشعار بأن الخلق لايأنفون عن مبايعتهم أن قابلية المتبوعية مجبولة في جبلتهم فينبغي أن لا يخرج عنهم أمر الخلافة لئلا يترتب عليه المخالفة [11]

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث (الناس تبع لقریش إلخ ) میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگ قریش کی تابعداری سے نفرت نہیں کریں گے، اور پیشرو اور خلیفہ ہونے کی قابلیت ان کی سرشت میں رکھی گئی ہے۔اس لیے مناسب یہی ہے کہ ان سے خلافت کا امر نکالا نہ جائے تاکہ اس پر مخالفتیں نہ پیدا ہوں۔

اور اگر اس خبر کو اپنے معنی ہی میں لیا جائے یعنی نفس امامت حفظ قریش کے لیے ہے، دوسروں کے لیے نہیں تو یہ پیش گوئی جناب رسول علیہ السلام کی ایک خاص زمانہ تک کے لیے ہے۔ چنانچہ خود علامہ سیوطی اور علی قاری رحمہما اللہ تعالیٰ اس کی تصریح فرمارہے ہیں اور جبکہ لفظ ما أقاموا الدين خود بخاری کی روایت میں موجود ہے، تو پھر اس تخصیص کی بھی ضرورت نہیں، جب تک قریش نے حقوق واجبہ رعایت کی خداوند کریم نے ان میں بادشاہت اور خلافت رکھی اس کے بعد چھین لی۔

بہت سے علمائے حدیث وفقہ رحمہم اللہ تعالیٰ اس حدیث کو خبر بمعنی امر فرمارہے ہیں جس کا رخ فقط اس خلیفہ کی جانب ہوگا، جس کو امت نے باہمی مشورے سے خلیفہ بنایا ہو یا سابق خلیفہ نے اس کو ولی عہد کے طور پر خلیفہ مقرر کیا ہو، لیکن اگر کوئی شخص اپنی قوت اور سطوت سے خلیفہ ہو جائے تو اس کے لیے قریشیت وغیرہ شرط نہیں۔ ایسے امام کی اطاعت

[11] (مرقاة المفاتيح، 9/ 3862)

اوراعانت اسی طرح واجب رہے گی، جیسے کہ اس امام کی جس میں خلافت کی تمام شرائط موجود تھیں۔ تمام فقہی مصادر میں اس کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

## ۱۰: جدید قومی ریاست اور جہاد

آج کل دنیا میں جتنی بھی ریاستیں ہیں وہ قومی ریاستوں کے نام سے موسوم ہیں۔ قومی ریاست کا مطلب یہ ہے کہ بین الاقوامی طور پر خطے کے ہر ملک کی حدود متعین و محفوظ ہیں۔ ماضی کی طرح کوئی بھی طاقتور ملک کسی کمزور ملک پر قبضہ نہیں کر سکتے اور اس کے جغرافیائی حدود کو چیلنج نہیں کر سکتے جس سے بہر حال کمزور ممالک طاقتور ممالک کے قبضے سے محفوظ ہیں۔

مگر یہاں پر جدید قومی ریاست کے بارہ میں ایک بہت اہم بنیادی احساس اور سوال جو کہ ہمارے مذہبی اذہان میں بہت شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے، یہ ہے کہ اس تصور کو قبول کرنا درحقیقت جہاد کی تنسیخ کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے، جو اسلامی تصور حکومت و اقتدار کا ایک جزولاینفک ہے، اس کی تشریح اس طرح ہے کہ اسلامی شریعت میں مسلمان ریاست کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اعلی کلمتہ اللہ کے لئے چند ضروری شرائط کے ساتھ ارد گرد کے علاقوں میں قائم غیر مسلم حکومتوں کے خلاف جنگ کرکے یا تو ان کا خاتمہ کرکے ان علاقوں کو مسلمان ریاست کا حصہ بنائے یا کم سے کم انہیں اپنے تابع کرکے جزیہ دینے پر مجبور کردے۔ قومی ریاست کے جدید تصور میں ظاہر ہے کہ اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ اپنی جغرافیائی حدود میں سیاسی خود مختاری کو ہر قومی ریاست کا بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے اور کسی ریاست کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی بھی بنیاد پر دوسری ریاست کی جغرافیائی حدود یا انتظام کار میں براہ راست مداخلت کرے، یوں جہاد اور قومی ریاست میں گویا تباہی کی نسبت پائی جاتی ہے۔

تاہم مذہبی فکر کو اس عملی حقیقت کا بھی ادراک ہے کہ موجودہ عہد میں معاشروں کی بقا سرتاسر قومی ریاست کے تصور پر منحصر ہے، اس لئے جہاں یہ سوال اہم ہے کہ قومی ریاست میں

جہاد کا امکان باقی رہتا ہے یا نہیں وہاں یہ سوال بھی اتنا ہی ہے کہ اس سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اگر قومی ریاست کے تصور کو کالعدم کر دیا جائے تو بحالت موجودہ معاشروں کی نفس بقا کیسے ممکن ہو گی۔

یہ معلوم ہے کہ دور جدید میں نہ صرف استعمار (یعنی طاقت کے زور پر بالادست قوموں کے کمزور قوموں پر مسلط ہونے کے عمل) کا خاتمہ قومی ریاست کے تصور کے تحت ہی ممکن ہوا ہے، بلکہ طاقتور قوموں کے جنگ وجدل اور خون ریزی کا سلسلہ بھی اسی اصولوں کو قبول کر لینے کی بدولت ہی رکا ہوا ہے۔

مزید برآں طاقتور قوتوں کے جواز میں قائم چھوٹ چھوٹے ممالک بھی اگر ایک سطح پر انفرادیت خود ارادی سے بہرہ ور اور اپنے زور آور پڑوسیوں کے براہ راست چیرہ دستی سے محفوظ ہے تو اس کے پیچھے بھی قومی ریاست کے احترام کا ہی اصول کارفرما ہے۔اور اگر دیکھا جائے تو جدید قومی ریاست کے تصور کے اس احترام کی وجہ سے زیادہ تر فائدہ مسلم ممالک کو ہو رہا ہے کیونکہ آج کل اکثر وبیشتر کمزور ممالک میں مسلمان ریاستیں ہی سر فہرست ہیں۔ چنانچہ خدانخواستہ آج اگر اسی اصولوں کے حوالے سے بین الاقوامی اتفاق رائے ختم ہو جائے تو ایک نئی جنگ عظیم کا شروع ہو جانا ہفتوں یا دنوں کی نہیں بلکہ لمحوں کی بات ہے، اور اس سارے فساد میں خاص طور پر کمزور اور پسماندہ قومیں جس تباہی سے دوچار ہوں گی اس کا بس تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

بہر حال یہ ایک عجیب صورتحال ہے ہماری مذہبی فکر کے سامنے میں جس کے عموماً علما کرام دو طرح کے جوابات دیتے ہیں،

کہ قومی ریاستوں کے تصور کو قبول کرنا بادل نخواستہ اور بامر مجبوری ایک وقتی اور عارضی طور پر صورتحال کہ طور پر قبول کیا گیا ہے، جب تک یہ عملی رکاوٹ موجود ہو اس وقت تک جہاد کی عملی طور پر کرنا معطل کیا جائے گا

لیکن اسے کوئی مستقل اور میعاری اصول نہ مانا جائے۔

دوسرا جواب یہ کہ آج کے دور میں جہاد کا تصور مختلف ہو گیا ہے کہ براہ راست جغرافیائی حدود میں دخل اندازی کی بجائے معاشی اور سائنسی ایجادات اور ترقی کے ذریعے جہاد کرے اور غیر مسلم پر اپنا اثر ورسوخ بڑھائے۔ بہر حال اس دور میں اہل علم اور دانشور ملت کے لئے یہ ایک اہم سوال ہے کہ ہم کس طرح اس صورتحال سے پیش آئے۔

باب پنجم

# قومی اور بین الاقوامی قوانین کی شرعی حیثیت

## قانون وضعی کی حیثیت

کسی قانون کے حوالے سے جب بات ہوتی ہے تو بعض حضرات یہ دلیل دیتے ہیں کہ اصل قانون وسنت ہے اور انسانوں کا بنا قانون شرکت فی الحکم ہے لہذا اگر انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو لازماً شرک فی الحکم سمجھا جائے تو پھر یہی حکم خلفائے بنو امیہ سے لے کر عثمانی خلفاء تک سب حکمرانوں کے جاری کردہ فرامین اور وضع کردہ قواعد کو بھی دینا ہوگا۔

ہر قانونی نظام میں صحیح (Valid) اور غیر صحیح (Invalid) قوانین میں فرق کے لیے قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ مثلاً پارلیمنٹ کسی موضوع پر قانون سازی کے لیے بنیادی قواعد ایک قانون کے ذریعے طے کردیتی ہے جو Parent Act کہلاتا ہے۔اس ایکٹ کے ذریعے کسی دوسرے ادارے کو قانون سازی کے اختیارات تفویض (Delegate) کردیے جاتے ہیں۔ وہ ادارہ جو قوانین وضع کرتا ہے اگر وہ Parent Act کے وضع کردہ قواعد کی رو سے صحیح ہوں تو انھیں ملک کے قانونی نظام کا حصہ سمجھا جائے گا، باوجود اس کے کہ ان قوانین کو پارلیمنٹ کے بجائے ایک ماتحت ادارے نے وضع کیا ہوتا ہے ۔ پھر ہر قانونی نظام میں ایک اساسی قاعدہ (Grundnorm) ہوتا ہے جو خود صحیح ہوتا ہے اور اس کی بنیاد پر دیگر تمام قوانین کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔اسلامی قانون کا بنیادی قاعدہ ہے کہ :ان الحکم الا اللہ (یوسف:۴۰)

پس وضعی قوانین کو الہامی نہیں قرار دیا جاسکتا، لیکن وہ اسلامی قانون ہی کا حصہ ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ مذکورہ بالا قاعدہ کی رو سے صحیح ہوں۔یہی وجہ ہے کہ فقہا تعزیری سزاؤں کا ذکر کتاب الحدود میں ہی کرتے ہیں۔جب قرآن وسنت نے اس طرح کے معاملات میں قانون سازی کا اختیار اولوالامر کو دیا ہے تو پھر اس پر اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

البتہ وضعی قوانین پر یہ شبہ یقیناوزنی ہے کہ وہ اسلامی قانون کے بجائے انگریزوں کے وضع کردہ قوانین سے ماخوذ ہیں۔اس کی وجہ یہی ہے کہ پاکستان میں قانون ساز اداروں اور شعبہ قانون سے وابستہ بعض افراد کا موقف یہ ہے کہ جو قوانین قرآن وسنت سے "متصادم" نہیں ہیں وہ از خود صحیح ہیں۔اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ اسلامی قانون کے قواعد عامہ نظرانداز کردیے جاتے ہیں بلکہ "عدم تصادم" کو "مطابقت" کے مترادف سمجھ لیا جاتا ہے۔

فقہانے اسلامی قانون کا جو ڈھانچہ بنایا ہے اس میں ہر قسم کا قانون ایک خاص قسم کے حق کے ساتھ منسلک ہے۔ان حقوق میں باہم ترجیح کے لیے فقہانے خاص اصول بھی وضع کیے ہیں۔ جب تک حقوق کے اس نظام کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے،اسلامی قانون کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں برقرار رہیں گی۔اس ڈھانچے میں ہر قانون کا تعلق یا تو اللہ کے حق سے ہوتا ہے یا بندے کے حق سے جس حق العبد کہتے ہیں۔ بعض اوقات قانون کا تعلق ریاست یا معاشرے کے حق سے ہوتا ہے جسے حق السلطان یا حق السلطنۃ کہتے ہیں۔ حق جس کا ہوتا ہے اسے جرم کی معافی کا بھی اختیار ہوتا ہے اگر حقوق اللہ اور حقوق السطان ایک ہی ہوتے (جیسا کہ کئی معاصر اہل علم نے فرض کیا ہے) تو پھر جن جرائم کو حقوق اللہ سے متعلق سمجھا جاتا ہے (حدود) ان میں ریاست کے پاس معافی کا اختیار ہوتا۔اسی طرح حق کے مختلف ہونے کی وجہ سے جرم کے ثبوت اور بعض دیگر متعلقہ مسائل (مثلاً شبہ کا اثر) بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات دو قسم کے حقوق مل کر ایک مشترک حق بناتے ہیں۔

ایسے جرائم جن کا تعلق حق السلطان سے ہے اور جن کی سزا کی مقدار کا تعین بھی اولوالامر (حکمرانوں) کے ذمے ہے،ان کو فقہائے احناف "سیاسۃ" جرائم کہتے ہیں۔ان جرائم میں معیار ثبوت کا تعین بھی حکومت کے پاس ہے اور معافی کا اختیار بھی وہ رکھتی ہے، جرم کی نوعیت کے

مطابق سزا کا تعین حکومت کرتی ہے اور اس سلسلے میں ایسی کوئی قید نہیں ہے کہ سزا حد کی مقدار سے زائد نہ ہو۔ چنانچہ بعض حالات میں سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے۔

## پارلیمانی نظام حکومت آمریت سے بہتر ہے:

باقی رہا سوال پارلیمانی نظام حکومت کا تو وہ آمریت اور تغلب کے طریق کار سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر کوئی غلام امارت حاصل کرے تو اس کی اطاعت معروف میں واجب ہے جیسا کہ کسی متغلب حاکم کی بھی معروف میں اطاعت لازم ہے، تو ایسے حاکم کی اطاعت تو بدرجہ اولیٰ لازم ہونی چاہیے جو عوام کی مرضی سے حکومت حاصل کرے۔ جب ہم اس حقیقت پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ امام دراصل ماموین کا وکیل ہوتا ہے۔ تغلب کی صورت میں وہ عقد وکالت کے بغیر یہ منصب حاصل کرتا ہے، جبکہ چناؤ کی صورت میں وہ موکل کی مرضی سے وکیل بن جاتا ہے، خواہ مرضی کا یہ اظہار کتنا ہی ناقص ہو یہ تغلب سے بہتر ہے۔

پارلیمنٹ کیا ہر قسم کی قانون سازی کر سکتی ہے؟ کیا اس کا یہ اختیار مطلق ہے؟ مغرب میں اقتدار اعلیٰ کے متعلق جو بحثیں ہوئیں، ان کے نتیجے میں پہلے نظری سطح پر یہ بات مان لی گئی کہ اقتدار اعلیٰ عوام کے پاس ہے۔ انتخاب کی صورت میں وہ یہ اختیار اپنے نمائندوں کو تفویض کر دیتے ہیں۔ تاہم اس تفویض کے عمل سے دو باتیں از خود ثابت ہو جاتی ہیں: ایک یہ کہ جن کو اختیار تفویض کیا گیا وہ مطلق اختیار کے حامل نہیں ہیں؛ دوسری یہ کہ جنھوں نے اختیار تفویض کیا وہ بھی مطلق اختیار کے حامل نہیں رہے۔ بالفاظِ دیگر اقتدار اعلیٰ کسی کے پاس نہیں رہا۔

اب یہ بات صرف کاغذات تک ہی محدود ہے کہ پارلیمنٹ اقتدار اعلیٰ کی حامل ہے، حقیقت یہ ہے جیسا کہ پیچھے واضح کیا گیا کہ ریاست بھی اقتدار اعلیٰ کی حامل نہیں ہے چہ جائیکہ پارلیمنٹ!

برطانیہ کے نظام حکومت کو پارلیمانی نظام حکومت کی سب سے بہترین مثال سمجھا جاتا ہے لیکن وہاں بھی پارلیمنٹ کے اقتدار اعلیٰ کا تصور ختم ہوتا جارہا ہے اور اس کی جگہ "کابینہ کی آمریت" کے تصور نے جنم لیا ہے۔ امریکا میں جہاں عدالتوں کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کانگریس کے وضع کردہ قانون کو ختم کرسکتی ہے، وہاں کانگریس کے بجائے آئین کی بالادستی کی بات کی جاتی ہے، جس کی محافظ عدالت عظمیٰ ہے۔ اسی طرح عدالت عظمیٰ کو اختیار دیا گیا کہ وہ صدر کے جاری کردہ فرامین کو بھی کالعدم قرار دے۔ تاہم کانگریس آئین میں ترمیم کرسکتی ہے؟ جو اگرچہ ایک نہایت مشکل کام ہے لیکن بہرحال اس کا اختیار کانگریس کے پاس ہے۔ اس طرح کانگریس عدالت کے اختیارات کو محدود کرسکتی ہے، کانگریس کے اس اختیار پر ایک قدغن لگانے کے لیے سربراہ ریاست، یعنی صدر کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کانگرس کے منظور کردہ قانون کو ویٹو کے اختیار کے استعمال کے ذریعے مسترد کردے۔ بھارت میں پارلیمنٹ کے اس اختیار کو مزید محدود کردیا گیا ہے کہ وہ آئین میں اس طرح کی ترمیم نہیں کرسکتی کہ اس سے آئین کا بنیادی ڈھانچہ ہی تبدیل ہوجائے۔ پس "قانون سازی کے مطلق اختیار" کا وجود کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ محض ایک تخیل اور وہم ہے، پاکستان کے نظام پر آگے کچھ تفصیلی بحث آئے گی۔

Naturalists کی کاوشوں سے ریاست اور پارلیمنٹ کے مطلق اختیارات پر ایک بڑی قدغن لگ گئی۔ ایک دوسری قدغن، جس کا پیچھے بھی ذکر کیا گیا، عدالتوں نے بالخصوص عدالتی نظرثانی (Judicial Review) کے اختیار کے ذریعے لگائی۔ نیز خود مغربی مفکرین کو مطلق العنانی کے سدباب کے لیے "اختیارات کی تقسیم" کا نظریہ پیش کرنا پڑا۔ جس کے تحت قانون سازی کا اختیار پارلیمنٹ کو دیا گیا۔ تعبیر قانون کا اختیار عدالتوں کو اور تنفیذ قانون کا اختیار انتظامیہ کے سپرد کردیا گیا۔ پھر مغرب میں یہ بحث بھی چھڑ گئی کہ اگر قانون سازی کا اختیار پارلیمنٹ کے

پاس ہے تو جج کا کیا کردار ہے؟ کیا وہ قانون سازی کرتا ہے، یا وہ محض قانون کی تعبیر کرتا ہے۔ اگر قانون کی تعبیر سے مراد صرف یہ ہے کہ لفظ کے ظاہر تک محدود رہے تو پھر نئے پیش آمدہ مسائل کا حل کیسے پیش کیا جائے گا۔ پھر وہاں اسی طرح کے مباحث نے جنم لیا جس سے مسلمان اہل علم پہلے ہی آشنا تھے، یعنی اہل ظاہر اور اہل رائے کے مباحث! جہاں کہیں کسی جج نے قانون کے پیچھے کارفرما اصولوں کا استخراج کر کے کسی مسئلے کا حل پیش کیا۔ بعض ظاہر پسندوں نے اسے "قانون سازی" قرار دیتے ہوئے پارلیمنٹ کے اختیارات پر حملہ قرار دیا۔ تاہم "اہل رائے" ججوں کی کاوشوں سے سینکڑوں نئے مسائل کا حل دریافت ہوا اور قانون نے ارتقا کا سفر جاری رکھا۔

## بین الاقوامی قانون کی حیثیت

بین الاقوامی قانون کے متعلق یہ تصور رہا ہے کہ اس کا نفاذ ریاست کی مرضی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ ریاست اقتدار اعلیٰ کی حامل ہے اس لیے اس پر بالادست قانون کوئی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ بالادستی کا مطلب ریاست کے اقتدار اعلیٰ کی نفی ہے، تاہم اقتدار اعلیٰ کا حامل شخص خود اپنے اوپر بعض پابندیاں عائد کر سکتا ہے، چنانچہ بین الاقوامی قانون ان پابندیوں کا مجموعہ ہے جو ریاست نے اپنے اوپر صراحتاً یا دلالتاً عائد کی ہیں۔ اول الذکر کو معاہدہ اور ثانی الذکر کو رواج کہتے ہیں۔ تاہم یہ انتہائی حد تک سادہ موقف اب بالکل متروک ہو چکا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ پیچھے ذکر کیا گیا، ریاست کے اقتدار اعلیٰ کا تصور صرف اعلان کی حد تک محدود رہ گیا، اس کے قانونی اثرات باقی نہیں رہے۔ قانونی اثرات صرف منعہ اور ولایہ کے ہیں۔ مزید برآں جب ریاست رواج یا معاہدے کی دفعات پر عمل کی پابند ہو گئی تو وہ اقتدار اعلیٰ کی حامل باقی نہیں رہی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بین الاقوامی عدالت انصاف کے ضابطے میں تصریح کی گئی ہے کہ بین الاقوامی قانون کے مآخذ میں محض رواج

اور معاہدات ہی شامل نہیں ہیں، بلکہ بین الاقوامی عدالتوں کے فیصلوں اور ممتاز ماہرین قانون کی تحریرات کے علاوہ مہذب اقوام کے نظامہائے قانون کے مسلمہ قواعد اور اصول بھی شامل ہیں، ان ماخذ میں کچھ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور کچھ بنیادی، تاہم اتنی بات طے ہے کہ ان سب کا ماخذ ریاست کا اقتدار اعلیٰ نہیں ہے۔

شریعت نے دارالاسلام اور دارالکفر کے درمیان جنگ و امن کے تعلقات کی تہذیب کے لیے کچھ قوانین نصوص کے ذریعے دیے ہیں اور دیگر امور کے لیے سیاسہ کے قاعدے کے تحت امام کو اختیار دے دیا ہے، مسلمانوں کے لیے شریعت کے احکام ہر صورت میں واجب الاطاعت رہیں گے خواہ فریق مخالف ان کو مانے یا نہ مانے، اور خواہ وہ ان کی پابندی کرے یا خلاف ورزی۔ گویا دیگر امور کی طرح اس شعبے میں بھی مسلمانوں پر شریعت کے احکام کی پابندی کی بنیاد تماثل اور مجازاۃ نہیں ہے۔ ہاں اگر فریق مخالف بھی ان امور کی پابندی پر آمادہ ہے اور ان کو معاہدات کے ذریعے منضبط کرنا چاہتا ہے تو یہ اور بھی بہتر ہے۔ امام محمد بن الحسن الشیبانی نے السیر الکبیر میں کئی ایسے فرضی معاہدات پر بحث کی ہے جو مسلمان دیگر اقوام کے ساتھ آداب القتال کے سلسلے میں کر سکتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ "یہ معاہدہ نہیں بلکہ قانون ہے لہٰذا جائز ہے" ایک انتہائی حد تک غلط موقف ہے کیوں کہ جیسا کہ پیچھے واضح کیا گیا، محض قانونی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے یہ ناجائز نہیں ہو جاتا، بالخصوص جبکہ اس معاہدے میں وہی کچھ طے کیا گیا ہو جو شریعت نے مسلمانوں پر لازم ٹھہرایا ہو۔

باقی رہی یہ بات کہ اگر معاہدے میں کوئی شق شریعت کے خلاف ہو تو کیا اس معاہدے پر دستخط کرنا ناجائز نہیں ہو گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خلاف شریعت کسی شرط کا ماننا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے (المسلمون عند شروطهم الا شرطاً أحل حراماً أو حرم حلالا) اس قسم کی شرط

ماننا یقیناناجائز ہے، بلکہ اگر اس قسم کی شرط مان بھی لی گئی تو اس پر عمل ناجائز ہوگا، تاہم بعض شرائط کے مقتضیات کے تعین پر اختلاف ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ بعض شروط کے ماننے سے بعض لوگوں کے نزدیک کفر کی بالادستی ماننی لازم آتی ہو، جبکہ بعض دوسرے لوگوں کے خیال میں ہو سکتا ہے کہ یہ ان شروط کے ماننے کا لازمی تقاضانہ ہو۔ اس لیے کوئی مجہول بیان دینا مناسب نہیں ہوگا، بلکہ ضروری ہوگا کہ ہر ہر شرط کے مقتضیات پر الگ الگ بحث کی جائے اور پورے معاہدے کے مجموعی اثر پر اس کے بعد نظر ڈالی جائے، اس کے بعد ہی اس معاملے کی صحیح شرعی تکییف کی جاسکے گی۔ عقود اور شروط کے متعلق اصل صحت، نفاذ اور لزوم کا ہے۔ جو شخص دعویٰ کرے کہ کوئی شرط یا عقد اس اصل کے خلاف ہے تو ثبوت کا بار بھی اسی کے ذمے ہے۔

پچھلے مباحث کی روشنی میں یہ امر اصولی طور پر بالکل جائز ہے کہ مسلمان دیگر اقوام کے ساتھ مل کر ایسا معاہدہ کریں جس کے ذریعے وہ آپس کے تنازعات کے حل کے لیے کوئی پرامن طریقہ متعین کریں۔ اس معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والے فریق کے خلاف باہمی تعاون بھی اصولی طور پر جائز ہے۔ البتہ تفصیلات اور جزئیات پر بحث کی ضرورت ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگر دو گروہوں کے درمیان تنازعہ ہو اور ہمیں کسی ایک فریق کا ساتھ دینا پڑے تو کیا ہم اس بنیاد پر فیصلہ کریں گے کہ ان گروہوں میں مسلمان کون ہے؟ یا یہ دیکھیں گے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟ اگر ظالم اور مظلوم کے سوال کو نظرانداز کر کے ہم ہر حال میں صرف "مسلمان" ہی کا ساتھ دیں تو کیا یہ اسی طرح کی "قوم پرستی" نہیں ہو جائے گی جس پر مسلمان اہل علم عموماً تنقید کرتے ہیں۔[12]

[12] مزید تفصیل کے لئے پروفیسر ڈاکٹر محمد مشتاق کی کتاب جہاد، مزاحمت اور بغاوت ملاحظہ فرمائیں

باب ششم

# آئین پاکستان کی شرعی حیثیت

فصل دوم:

# کیا پاکستان کا آئین کفریہ ہے؟

عنوان میں مذکورہ سوال کے جواب میں مختصر طور پر دس اہم اطراف ذکر کئے جاتے ہیں:

## اولاً۔ پاکستان دارالاسلام ہے:

پاکستان میں شامل علاقے یقیناً دارالاسلام کی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔ یہاں کی آبادی کی غالب اکثریت مسلمان ہے، جنھوں نے باہمی معاہدے کے ذریعے یہ بھی طے کیا ہوا ہے کہ ان کا سربراہ مسلمان ہوگا۔ اگر بعض لوگوں کے خیال میں اس معاہدے کی بعض شقیں یا دیگر قوانین کی بعض جزئیات "ظہور احکام کفر" کے ضمن میں آتی ہیں، تو اس کے باوجود دارالاسلام کے دارالکفر میں تبدیل ہونے کے لیے جو دو مزید شرطیں درکار ہیں وہ یہاں نہیں پائی جاتیں۔ یہاں غلبہ اور قہر مسلمانوں کا ہے جس کی وجہ سے یہ علاقہ مسلمانوں کو ہی منسوب ہے، اور دارالکفر سے اتصال کی شرط بھی بدیہی طور پر مفقود ہے۔ ان امور کی مزید وضاحت کے لیے درج ذیل نکات پر غور کریں:

۱۔ 1949ء میں پہلی آئین ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی جس کی رو سے یہ طے پایا کہ پاکستان میں اسلامی قانون کو بالادستی حاصل ہوگی۔ اس قرارداد کے ذریعے پاکستان کے آئینی نظام کے بنیادی مقاصد کا تعین کیا گیا۔ یہ قرارداد پاکستان کے تینوں دساتیر 1956، 1962، اور 1973 میں دیباچے کے طور پر شامل کی گئی۔ پھر 1973ء کے آئین میں آٹھویں ترمیم کے ذریعے 1985 میں اسے دفعہ ۲۔الف کے تحت آئین سے

انحراف کے دور میں بھی قرارداد مقاصد کو ناقابل تنسیخ و تعطیل سمجھا گیا اور اسی بنا پر عاصمہ جیلانی کیس 1972ء میں قرار دیا گیا کہ مارشل لا کا نظام ناجائز ہے اور حکومت کو مجبور کیا گیا کہ وہ مارشل لا ختم کرکے آئینی نظام بحال کرلے۔

۲۔ 1952ء میں پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے جید علمائے کرام نے آئین کی اسلامی حیثیت ماننے کے لیے بائیس نکات دیے۔ پاکستان میں تمام دساتیر میں ان بائیس نکات کی روشنی میں اسلامی دفعات شامل کی گئیں، مثال کے طور پر سربراہ ریاست کے لیے مسلمان ہونے کی شرط ضروری قرار دی گئی ہے۔ 1973ء میں آئینی ترمیم کے ذریعے "مسلمان" کی تعریف بھی آئین میں شامل کی گئی جس کے تحت قادیانی بلکہ بہائی بھی غیر مسلم قرار دیے گئے ہیں۔ اور یہ کہ تمام قوانین کو اسلامی شریعت کے مطابق کیا جائے گا اور تمام غیر اسلامی قوانین ختم کردیے جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے پارلیمنٹ کی رہنمائی کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل بھی تشکیل دی گئی ہے۔

۳۔ 1977ء کے انقلاب کے بعد پہلے عدالت ہائے عالیہ میں شریعت بنچ قائم کیے گئے۔ بعد میں یہ بنچ ختم کرکے ان کی جگہ وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی جسے یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اسلامی شریعت سے متصادم قوانین کو تصادم کی حد تک کالعدم قرار دے۔ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف جب سپریم کورٹ میں اپیل کی جاتی ہے، تو اس کی سماعت کے لیے خصوصی شریعت اپیلیٹ بنچ قائم کی گئی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت اور شریعت اپیلیٹ بنچ دونوں میں علما جج بھی تعینات کیے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ اگر وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل نہ ہو تو پھر اس فیصلے کی پابندی سپریم کورٹ پر بھی لازم ہوتی ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے ابتدا (1980ء) میں چار قوانین خارج کیے گئے:

الف۔ آئین

ب۔ عدالتوں کے طریق کار سے متعلق قوانین

ج۔ مسلم شخصی قوانین

د۔ مالیاتی امور سے متعلق قوانین

## ۴۔ پاکستانی حکمرانوں اور عدالتوں کی شرعی حیثیت: جید علما کا فتوی:

پاکستان کے حکمرانوں اور عدالتوں کے فیصلوں کی شرعی حیثیت کے متعلق ایک اہم دستاویز وہ فتویٰ ہے جس کا اصل موضوع تو رؤیتِ ہلال کا مسئلہ تھا، لیکن اس سے زیر بحث مسئلے میں بھی نہایت واضح اور دوٹوک رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد رؤیت ہلال کے سلسلے میں عمومی اتفاق قائم کرنے کی ایک اہم کوشش مولانا مفتی محمد شفیع نے کی۔ انھوں نے پہلے ایک سوالنامہ مرتب کر کے ہندو پاک کے ممتاز علما کے پاس بھجوایا۔ پھر ستمبر 1954ء میں قاسم العلوم ملتان میں جید علمائے کرام کا ایک اہم اجتماع منعقد کرایا۔ جس میں دو دن کے تفصیلی مباحثہ کے بعد ''زبدۃ المقال فی رویۃ الہلال'' کے عنوان سے ایک متفقہ فتویٰ تیار کیا گیا۔ اس فتوے میں پاکستانی حکومت کے فیصلوں کی شرعی حیثیت کے متعلق جو سوالات قائم کئے گئے ہیں اور ان کے جو جوابات دیے گئے ہیں، وہ زیر بحث مسئلے میں قول فیصل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے یہاں اس فتوے سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ پاکستانی حکمرانوں اور عدالتوں کی شرعی حیثیت کے تعین کے لیے اس فتوے میں تین سوالات قائم کئے گئے۔

- **پہلا سوال:** جو شخص قوت کے بل بوتے پر اقتدار پر غالب ہو جائے اور اربابِ حل وعقد اس کی حکمرانی پر راضی نہ ہوں کیا اس کی حکومت صحیح ہے اور اس کی جانب سے قاضیوں کی تقرری جائز ہے؟
- **دوسرا سوال:** کیا فاسق قضا کے لیے اہل ہے؟
- **تیسرا سوال** : احکام شرعیہ سے عدم واقفیت کسی قاضی کی اہلیتِ قضا ختم کر دیتی ہے؟

ان میں پہلے سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگرچہ احادیث نبویہ اور عبارات فقہیہ کے بموجب اصولاً حکمران کا ارباب حل وعقد کے مشورے سے مقرر کرنا ضروری ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص طاقت کے بل بوتے پر حکومت پر قابض ہو جائے تو جائز امور میں اس کی اطاعت سب مسلمانوں پر واجب ہوتی ہے اور اس کی ماتحتی میں قضا اور دیگر مناصب کی ذمہ داری قبول کرنا جائز ہوتا ہے، خواہ مسلمانوں کے اہل علم میں کسی ایک نے بھی اس کی بیعت نہ کی ہو، جب تک کہ وہ کفر بواح کا مرتکب نہ ہو جائے۔ اس کے بعد پاکستان کے حکمرانوں کے تناظر میں لکھا گیا ہے کہ پاکستان میں کئی معاملات میں حکام کا شرعی حکم الگ ہے (بعض صحیح اور نافذ ہوں گے اور بعض غیر صحیح اور غیر نافذ ہوں گے)۔

دوسرے سوال کے جواب میں واضح کیا گیا کہ فقہا کے نزدیک قضا کے لیے عدل شرط جواز نہیں، بلکہ شرط مستحسن ہے یعنی اس صفت کا قاضی میں موجود ہونا بہتر ہے اگرچہ اس کے بغیر بھی قاضی کے منصب پر تعیناتی جائز ہے۔ یہاں ابن عابدین کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اگر یہ بات مان لی گئی کہ فاسق قضا کا اہل نہیں ہے تو بالخصوص ہمارے دور میں قضا کا کام سرے سے ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے بعد ابن الہُمام کا یہ قول نقل کیا گیا کہ جسے سلطان کی جانب سے قضا کا منصب سونپ دیا

گیا ہے، اس کے فیصلے نافذ ہوں گے خواہ وہ جاہل یا فاسق ہو۔ البتہ ایسے قاضی کو دوسروں کے فتویٰ پر فیصلہ دینا چاہیے۔

تیسرے سوال کے جواب میں پھر ابن الہمام کے مذکورہ بالا قول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں صراحتاً قرار دیا گیا ہے کہ جاہل کے فیصلے نافذ ہوں گے۔

واضح رہے کہ یہ فیصلہ ان علمائے کرام نے 1954ء میں اس وقت دیا تھا، جب ابھی پاکستان کا پہلا آئین بھی نہیں لکھا گیا تھا۔ 1956ء میں پاکستان نے آئینی طور پر 'اسلامی ریاست' ہونے کا اعلان کر لیا اور قرار دیا کہ پاکستان میں تمام قوانین اسلامی احکام کے مطابق ہوں گے۔ 1962ء کے آئین میں اس عزم کا اعادہ کیا گیا اور قوانین کو اسلامیانے کے لیے دو ادارے اسلامی مشاورتی کونسل اور ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی تشکیل دیے گئے۔ 1973ء کے آئین میں مزید اسلامی دفعات کا اضافہ کیا گیا اور 1973ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے آئین میں "مسلمان" کی تعریف بھی داخل کی گئی جس کی رو سے ختم نبوت کے منکرین غیر مسلم قرار پائے۔ 1977ء کے انقلاب کے بعد بڑے پیمانے پر قوانین میں تبدیلیاں لائی گئیں اور کئی قوانین کو اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں کی گئیں۔ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ کے علاوہ سپریم کورٹ اور عدالت ہائے عالیہ نے پچھلے چونسٹھ برسوں میں کئی اہم فیصلے دیے، جنھوں نے پاکستان کے قانونی نظام کے اسلامی تشخص کو محفوظ رکھنے میں اہم کردار کیا۔ پس اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ پاکستان دارالاسلام ہے۔ (ابھی حال ہی میں اٹھارہ سو سے زائد علما نے متفقہ فتویٰ جاری کیا جس کی رو سے پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور اس کے خلاف خروج جائز ہے)

## ثانیاً۔ آئین پاکستان: ایک صحیح، لازم اور نافذ معاہدہ:

- آئین پاکستان کی حیثیت یہاں کے مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدے کی سی ہے۔
- پس اس پر معاہدے سے متعلق قواعد لاگو ہوں گے جن میں سے ایک یہ ہے کہ معاہدے اور اس کی شقوں کو اصولاً صحیح مانا جائے گا۔
- جہاں کہیں کوئی شق اسلامی قانون کی رو سے غیر صحیح ہو، اس کی ایسی تاویل کی جائے گی جو اسے اسلامی قانون کے مطابق کر دے۔
- اگر کسی شق کی ایسی تاویل ممکن نہ ہو تو وہ باطل ہے اور اس پر عمل جائز نہیں ہے، خواہ معاہدے میں صراحتاً یہ بات لکھی گئی ہو کہ اس شق پر عمل واجب ہے اور خواہ اس شق پر عمل کو عدالتوں نے بھی واجب قرار دیا ہو۔ اسلامی قانون کا مسلمہ اصول ہے کہ قاضی کا فیصلہ اگر نص قطعی یا اجماع کے خلاف ہو تو وہ نافذ نہیں ہو گا۔

## ثالثاً۔ شریعت پر عمل عدالتی فیصلہ سے مشروط نہیں:

- مسلمانوں کے لیے شریعت کے کسی حکم پر عمل اس سے مشروط نہیں ہے کہ پہلے اس حکم کے متعلق عدالتی فیصلہ آئے۔ اس لیے اگر بینک کا انٹرسٹ کسی کے فہم کے مطابق رِبا ہے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس انٹرسٹ سے میں اس لیے اجتناب نہیں برت سکتا کہ ابھی اس کا معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے، بلکہ اس پر واجب ہو گا کہ وہ اس سے اجتناب کرے۔

- پاکستان میں سودی نظام کے بقا کی وجہ یہ نہیں کہ عدالت نے اسے ناجائز ٹھہرانے سے انکار کیا ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت اس معاملے میں یا تو بے حس ہے اور یا بے خبر۔

## رابعا: پارلیمنٹ کا قانون سازی کا اختیار مطلق نہیں:

- یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خواہ آئین میں قرار دیا گیا ہو کہ پارلیمنٹ کو قانون سازی کا اختیار مطلق ہے اس کے باوجود وہ مطلق نہیں ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ پارلیمنٹ اقتدار اعلی کی حامل نہیں ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ پارلیمنٹ کے ارکان کی غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ پس اگر اس پارلیمنٹ نے کوئی ایسا قانون منظور کیا جو قرآن و سنت سے متصادم ہو تو اس قانون پر سرے سے عمل جائز نہیں ہو گا کیوں کہ یہ پارلیمنٹ نے اپنے جائز اختیارات سے تجاوز کیا ہو گا۔ بلکہ اگر پارلیمنٹ آئین میں ترمیم کے ذریعے اس سے تمام اسلامی دفعات کا خاتمہ کرے، تب بھی وہ ترمیم ہی ناجائز ہو گی۔
- اس کی وجہ صرف یہ نہیں ہو گی کہ ججز کیس میں سپریم کورٹ نے طے کیا ہے کہ پارلیمنٹ آئین سے اسلامی دفعات کا خاتمہ نہیں کر سکتی، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہو گی کہ اسلام کے دعویدار ہوتے ہوئے ارکان پارلیمنٹ ایسا کر نہیں سکتے۔

## خامساً: شرعی عدالت کے اختیار سماعت سے باہر قوانین شریعت سے بالاتر نہیں:

- جہاں تک شرعی عدالت کے اختیار سماعت سے بعض قوانین کے اخراج کا معاملہ ہے تو وہ ایک انتظامی فیصلہ ہے۔ اگر یہ عدالت عائلی قوانین کے متعلق فیصلہ نہیں سنا سکتی تو اس سے

یہ لازمی نہیں آتا کہ یہ قوانین شریعت پر بالادست ہو گئے۔ اگر یہ مسلمانوں کا علاقہ ہے اور یہاں منعۃ اور ولایۃ مسلمانوں کے پاس ہے تو آئین سمیت یہاں کے تمام قوانین شریعت کے ماتحت ہیں اور رہیں گے، خواہ کوئی عدالت ان کے خلاف شریعت ہونے کا فیصلہ کر سکے یا نہ کر سکے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی قانون کو اگر یہ عدالت خلاف شریعت قرار دے تو وہ فیصلہ اس کو مستلزم نہیں کہ وہ قانون واقعتاً خلاف شریعت ہے۔

- باقی رہا اپیل کا معاملہ تو وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ عدالت کا فیصلہ بہر حال انسانی کاوش ہے۔ اس لیے اس پر بعض دیگر انسان مزید غور و فکر کریں تو غلطی کا احتمال کم ہو جاتا ہے۔ اگر اس اختیار کو بعض لوگوں نے غلط استعمال کیا ہے تو کون سا ایسا جائز کام ہے جسے ناجائز کام کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا؟ تو کیا اس بنا پر ہر جائز کام کو ناجائز قرار دیا جائے گا؟

## سادساً: پارلیمنٹ کو اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات ماننے کا پابند نہیں کیا جا سکتا:

- اسلامی نظریاتی کونسل کی حیثیت "ریاستی مفتی" کی ہے اور اس وجہ سے حکومت پر اس کی "تجاویز" کو ماننا لازم نہیں ہے۔ جب ہارون الرشید مختلف ائمۂ کرام کو اکٹھا کر کے ان سے استفتا کرتا تھا تو اس کے بعد ان میں کسی کی رائے پر عمل کرنا اس نے خود پر لازم قرار دیا تھا یا حتمی فیصلہ اسی کا ہوتا تھا؟
- نیز کیا ان نتائج پر بھی غور کیا گیا ہے جو اس کونسل کے فیصلے کو لازم قرار دینے سے پیدا ہوتے ہیں؟ اس فیصلے کو لازم کر دینے سے قبل آپ کو یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ اس کونسل کے ارکان کون ہوں گے؟ کیا وہ حکومت کے نامزد کردہ ہوں گے؟ یا ان کا بھی انتخاب کیا جائے گا؟ اگر انتخاب کے مسئلے کو "قدرتی چناؤ" کے سپرد کر دیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا

قدرتی چناؤ کا عملاً مطلب یہ نہیں ہوگا کہ معاملہ حکمران کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا؟ قبائلی اور بدوی زندگی میں قدرتی چناؤ اتنا دشوار نہیں ہوتا، جتنا شہری اور متمدن زندگی میں ہوتا ہے۔ پس آخر الامر معاملہ حکمران کی صوابدید پر ہی جا رکتا ہے!

## سابعاً: اسلامی نظریاتی کونسل اور شرعی عدالت صحیح سمت میں پیش رفت:

- اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے برعکس وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے لازمی حیثیت رکھتے ہیں کیوں کہ اس کی حیثیت "ریاستی قاضی" کی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت اور شریعت اپیلیٹ بنچ نے بعض غیر اسلامی قوانین کے خاتمے اور بعض نئے اسلامی قوانین کے اجرا کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی طرح ان عدالتوں نے شرعی قوانین کی توضیح اور تنفیذ کے سلسلے میں بعض اہم فیصلے سنائے ہیں۔ مجموعی لحاظ سے ان کی کارکردگی مثالی اور معیاری نہ سہی لیکن انھیں صحیح سمت میں پیش رفت کا نام ضرور دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً شرعی عدالت کے اختیار سماعت سے جن قوانین کو استثنا دیا گیا ہے ان کو بھی اس کے دائرہ اختیار میں لانا چاہیے۔ بلکہ زیادہ مناسب صورت تو یہی تھی کہ عدالت ہائے عالیہ میں شریعت بنچ ہوں۔

## ثامناً: آئین پاکستان اور پرامن انتقال اقتدار

- جو لوگ موجودہ حکمرانوں یا طرز حکمرانی سے نالاں ہیں اور اس لیے نظام کی تبدیلی اور انقلاب کے نعرے بلند کر کے لوگوں کو خروج کی طرف دعوت دیتے ہیں انھیں یہ بات مد نظر رکھنی چاہیے کہ خروج کے جواز کے لیے ایک بنیادی شرط پاکستان میں مفقود ہے، کیوں کہ یہاں تبدیلی پرامن ذرائع سے ممکن ہے۔

- اسلامی شریعت نے غیر مسلموں کے خلاف جنگ کی اجازت بھی صرف اس صورت میں دی ہے جب جنگ بالکل ہی ناگزیر ہو جائے۔ مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا مسئلہ تو اس سے بدرجہا زیادہ سنگین ہے۔ اس لیے اس کی اجازت اس صورت میں قطعاً نہیں دی جا سکتی جب تبدیلی واصلاح کے لیے پرامن ذرائع میسر ہوں۔

## تاسعاً: عصر حاضر میں خروج کے نتائج:

امام ابو حنیفہ اگرچہ اپنے معاصر اموی خلفا اور ان کے عہد عباسی خلفا کی نااہلیت کے قائل تھے اور ان کے شدید ناقدین میں تھے، نیز آپ تبدیلی کے حامی بھی تھے اور اصولاً خروج کے جواز کے قائل بھی تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے خروج کا راستہ اختیار کرنے سے گریز کیا اور جب خراسان کے مشہور فقیہ ابراہیم الصائغ نے انھیں خروج کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی تو آپ نے فرمایا:

> "یہ کام ایک آدمی کے بنانے سے نہیں بن سکتا۔ انبیا بھی اس کے کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، جب تک وہ اس کام کے لیے آسمان سے مامور نہ کیے جاتے۔ یہ فریضہ دیگر فرائض کی طرح نہیں ہے جنھیں کوئی بھی شخص تنہا ادا کر سکتا ہے۔ یہ کام ایسا ہے کہ تنہا آدمی اس کے لیے کھڑا ہو گا تو اپنی جان دے گا اور خود کو ہلاکت میں ڈالے گا اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے قتل میں اعانت کا ذمہ دار ٹھہرے گا۔ پھر جب ایک ایسا شخص قتل کیا جائے گا تو پھر کوئی دوسرا اس کام کے لیے اپنی جان ہلاکت میں ڈالنے کی ہمت نہیں کر پائے گا"۔

## عاشراً: تعلیم وتربیت کے ذریعے ماہرینِ شریعت وقانون کی تیاری:

ان لوگوں کی اسلامی تربیت، اسلامی قانون کی عصری اسلوب میں صحیح تعبیر اور عصر حاضر کے حل کے لیے اسلامی قانون کی رہنمائی کی توضیح بہت زیادہ محنت کا کام ہے۔ اس لیے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے بجائے اس کام کے لیے باصلاحیت لوگوں کو آگے بڑھ کر کام کرنا چاہیے۔ یہ ایک فرض کفائی ہے جس کی ادائیگی کے لیے "کافی" لوگ دستیاب نہیں ہیں۔ جو لوگ یہ کام کر سکتے ہیں وہ اور کاموں میں الجھے ہوئے ہیں، اور جن کا یہ کام نہیں ہے وہ خود کو اس کے ماہر قرار دے کر اپنی عاقبت بھی خراب کر رہے ہیں اور دوسروں کا بھی بیڑہ غرق کر رہے ہیں۔

(بحوالہ جہاد، مزاحمت اور بغاوت از پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد)

فصل دوم:

# پیغام پاکستان کے عنوان سے متفقہ فتوی

## متفقہ اعلامیہ:

قرآن وسنت کی تعلیمات اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے متفقہ دستور کے تقاضوں کے عین مطابق پیغام پاکستان کے ذریعے درج ذیل اقدامات کا اعلامیہ پیش کیا جاتا ہے:

۱: پاکستان کا ۱۹۷۳ء کا دستور اسلامی اور جمہوری ہے اور پاکستان کی تمام اکائیوں کے درمیان سماجی اور عمرانی معاہدہ ہے جس کی توثیق تمام سیاسی جماعتوں کے علاوہ تمام مکاتب فکر کے علماؒ ومشائخ نے متفقہ طور پر کی ہوئی ہے، اسلئے اس دستور کی بالادستی کو ہر صورت میں یقینی بنایا جائے، نیز ہر پاکستانی ریاست پاکستان کے ساتھ ہر صورت میں اپنی وفاداری کا وعدہ وفا کرے۔

۲: اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی رو سے تمام شہریوں کو بنیادی حقوق کی ضمانت حاصل ہے ان حقوق میں قانون واخلاق عامہ کے تحت مساوی حیثیت و مواقع، قانون کی نظر میں برابری، سماجی، اقتصادی اور سیاسی عدل، ظہار خیال، عقیدہ، عبادت اور اجتماع کی آزادی شامل ہے۔

۳: اسلامی جمہوریہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے، جس کے دستور کا آغاز اس قومی وملی میثاق سے ہوتا ہے: اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم ہے اور پاکستان کے جمہور کو جو اختیار واقتدار اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کا حق ہے وہ ایک مقدس امانت ہے، نیز دستور میں اس بات کا اقرار بھی موجود ہے کہ ا سمملک میں قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا، اور موجودہ قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالا جائے گا۔

۴: پاکستان کے آئین وقانون کے دائرے میں رہتے ہوئے قرآن وسنت کے احکام کے نفاذ کی پرامن جدوجہد کرنا ہر مسلمان کا دینی حق ہے، یہ حق، دستور پاکستان کے تحت اسے حاصل ہے اور اس کی ملک میں کوئی ممانعت نہیں ہے، جب کہ بہت سے ملی اور قومی مسائل کا سبب اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد سے روگردانی ہے۔ اس حوالے سے پیش رفت کرتے ہوئے ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شریعت اپیلنٹ بینچ کو مزید فعال بنایا جائے۔

۵: دستور کے کسی حصہ پر عمل کرنے میں کسی کوتاہی کی بناپر ملک کی اسلامی حیثیت اور اسلامی اساس کا انکار کسی صورت درست نہیں، لہذا اس کی بناپر ملک یا اس کی حکومت، فوج یا دوسری سیکیورٹی ایجنسیوں کے اہلکار کو غیر مسلم قرار دینے اور ان کے خلاف مسلح کاروائی کا کوئی شرعی جواز نہیں ہے اور ایسا عمل اسلامی تعلیمات کی رو سے بغاوت کا سنگین جرم قرار پاتا ہے۔ نفاذ شریعت کے نام پر طاقت کا استعمال، ریاست کے خلاف مسلح محاذ آرائی، تخریب وفساد اور دہشت گردی کی تمام صورتیں، جن کا ہمارے ملک کو سامنا ہے، قطعی حرام ہیں، شریعت کی رو سے ممنوع ہیں اور بغاوت کے زمرے میں آتی

ہیں، یہ ریاست، ملک و قوم اور وطن کو کمزور کرنے کا سبب بن رہی ہیں اور ان کا تمام تر فائدہ اسلام دشمن اور ملک دشمن قوتوں کو پہنچ رہا ہے۔ لہذا ریاست کے ان کو کچلنے کے لئے ''ضرب عضب'' اور ''ردالفساد'' کے نام سے جو آپریشن شروع کر رکھے ہیں اور قومی اتفاق رائے سے جو لائحہ عمل تشکیل دیا ہے ان کی مکمل حمایت کی جاتی ہے۔

۶: دہشت گردی کے خلاف جنگ میں علماء اور مشائخ سمیت زندگی کے تمام شعبوں کے طبقات ریاست اور مسلح افواج کے ساتھ کھڑے ہیں اور پوری قوم قومی بقا کی اس جنگ میں افواج پاکستان اور پاکستان کے دیگر سیکیورٹی اداروں کے ساتھ مکمل اور غیر مشروط تعاون کا اعلان کرتی ہے۔

۷: تمام دینی مسالک کے نمائندے علما نے شرعی دلائل کی روشنی میں قتل ناحق کے عنوان سے خودکش حملوں کے حرام قطعی ہونے کا جو فتوی جاری کیا تھا اس کی مکمل حمایت کی جاتی ہے، نیز لسانی، علاقائی، مذہبی اور مسلکی شناختوں کے نام پر جو مسلح گروہ ریاست کے خلاف مصروف عمل ہیں، یہ سب شریعت کے احکام کے منافی اور قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا سبب ہیں، لہذا ریاستی اداروں کو ان تمام گروہوں کے خلاف بھرپور کاروائی کرنے کی تجویز دیتے ہیں۔

۸: فرقہ وارانہ منافرت، مسلح فرقہ وارانہ تصادم اور طاقت کے بل پر اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنے کی روش شریعت کے احکام کی مخالفت اور فساد فی الارض ہے، نیز اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور و قانون کی رو سے ایک قومی اور ملی جرم ہے۔

۹: وطن عزیز میں قائم تمام درسگاہوں کا بنیادی مقصد تعلیم و تربیت ہے، ملک کی تمام سرکاری و نجی درسگاہوں کا کسی نوعیت کی عسکریت (militancy) نفرت انگیزی (hartred)، انتہا پسندی (extremism) اور تشدد پسندی (violence) پر مبنی تعلیم یا تربیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر کوئی فرد یا ادارہ اس میں ملوث ہے تو اس کے خلاف ثبوت و شواہد کے ساتھ کارروائی کرنا حکومت اور ریاستی اداروں کی ذمے داری ہے۔

۱۰: انتہا پسندانہ سوچ اور شدت پسندی کے خلاف فکری جہاد اور انتظامی اقدامات ناگزیر ہیں، گزشتہ عشرے سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایسے شواہد سامنے آئے ہیں کہ یہ منفی رجحان مختلف قسم کے تعلیمی اداروں میں پایا جاتا ہے، اس لئے یہ رجحان فکر (mindset) جہاں کہیں بھی ہوں ہمارا دشمن ہے، ایسے لوگ خواہ کسی بھی درسگاہ سے منسلک ہوں، کسی رعایت کے مستحق نہیں

۱۱: ہر مکتب فکر اور مسلک کو مثبت اور معقول انداز میں اپنے عقائد اور فقہی نظریات کی دعوت و تبلیغ کی شریعت اور قانون کی رو سے اجازت ہے، لیکن اسلامی تعلیمات اور ملکی قانون کے مطابق کسی بھی شخص، مسلک یا ادارے کے خلاف اہانت، نفرت انگیزی اور اتہام بازی پر مبنی تحریر و تقریر کی اجازت نہیں۔

۱۲: صراحت، کنایہ اور اشارہ کی ذریعے کسی بھی صورت میں انبیائے کرام ورُسل عظام علیہم السلام، اہل بیت اطہار رضی اللہ عنھم، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، شعامر اسلام اور ہر مسلک کے مسلمہ اکابر کی اہانت کے حوالے سے ضابطہ فوجداری کے آرٹیکل ۲۹۵۔۲۹۸ کی تمام دفعات کو ریاستی اداروں کے ذریعہ لفظا اور معنانافذ کیا جائے اور اگران قوانین کا

کہیں غلط استعمال ہوا ہے تو اس کے ازالے کے احسن تدبیر ضروری ہے، مگر قانون کو کسی صورت میں کوئی فرد یا گروہ اپنے ہاتھ میں لینے اور متوازی عدالتی نظام قائم کرنے کا مجاز نہیں۔

۱۳: عالم دین اور مفتی کا منصبی فریضہ ہے کہ صحیح اور غلط نظریات کے بارے میں دینی آگہی مہیا کرے اور مسائل کا درست شرعی حل بتائے، البتہ کسی کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کرنا کہ آیا اس نے کفر کا ارتکاب کیا ہے یا کلمہ کفر کہا ہے، یہ ریاست و حکومت اور عدالت کا دائرہ اختیار ہے۔

۱۴: سرزمین پاک اللہ تعالی کی مقدس امانت ہے، اس کا ایک ایک چپہ اللہ تعالی کی طرف سے ریاست پاکستان کو ودیعت کردہ اقتدار اعلی کا امین ہے۔ اس لئے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سرزمین کسی بھی قسم کے دہشت گردی کے فروغ، دہشت گردوں کے گروہوں کی فکری و عملی تیاری، کسی بھی مقام پر دہشت گردی کے لئے لوگوں کی بھرتی، مسلح مداخلت اور اس جیسے دوسرے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے ہرگز استعمال نہیں ہونے دی جائے گی۔

۱۵: مسلمانوں میں مسالک و مکاتب فکر قرون اولی سے چلے آرہے ہیں، اور آج بھی موجود ہیں۔ ان میں دلیل واستدلال کی بنیاد پر فقہی اور نظریاتی ابحاث ہمارے دینی اور اسلامی علمی سرمائے کا حصہ ہیں اور رہیں گے، لیکن یہ تعلیم و تحقیق کے موضوعات ہیں اور ان کا اصل مقام درس گاہیں ہیں، اختلاف رائے کے اسلامی آداب (آداب مراعاۃ اخلاف)

(ethics of disagreement) کو تمام سرکاری و نجی درسگاہوں کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔

۱۶: اسلامی تعلیمات اور دستور پاکستان ۱۹۷۳ کے مطابق حکومت اور عوام کے حقوق و فرائض ہیں، جس طرح عوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے فرائض درست اسلامی تعلیمات اور دستور پاکستان کے تقاضوں کے مطابق انجام دیں، اسی طرح ریاستی ادارے اور ان کے عہدے دار بھی اپنے فرائض حقیقی اسلامی تعلیمات اور دستور پاکستان کے تقاضوں کے مطابق ادا کرنے کے پابند ہیں۔

۱۷: پُرامن بقائے باہمی اور باہمی برداشت کا فروغ پرامن اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے ضروری ہے، اس لئے اسلام کے اصولوں کے مطابق جمہوریت، حریت، مساوات، برداشت، رواداری، باہمی احترام اور عدل وانصاف پر مبنی پاکستانی معاشرے کی تشکیل جدید ضروری ہے، اس مقصد کے لئے ملک کے اہل علم و دانش اور اہل اختیار واقتدار کو مطلوبہ کاوشوں کو مربوط طریقہ سے ہم آہنگ کرنے پر توجہ دینا ہوگی۔

۱۸: اسلام احترام انسانیت اور اکرام مسلم، نیز بزرگوں، بچوں، خواجہ سراؤں، معذوروں اور دوسرے محروم طبقوں کے تحفظ کے لئے جو تعلیمات دیتا ہے، ان کی سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر ترویج ضروری ہے، نیز پاکستان معاشرے میں انسانی بھائی چارے اور مواخات جیسے اسلامی اداروں کے احیاء کے ذریعے صحیح اسلامی معاشرے کے قیام کے اقدامات کو یقینی بنایا جانا ضروری ہے۔

۱۹: پاکستان میں رہنے والے پابند آئین و قانون تمام غیر مسلم شہریوں کو جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ اور ملکی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے دہی تمام شہری حقوق حاصل ہیں، جو پابند آئین و قانون مسلمانوں کو حاصل ہیں، نیز یہ کہ پاکستان کے غیر مسلم شہریوں کو اپنی عبادت گاہوں میں اور اپنے تہواروں کے موقع پر اپنے اپنے مذاہب کے مطابق عبادت کرنے اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

۲۰: اسلام خواتین کو احترام عطا کرتا ہے اور ان کے حقوق کی پاسداری کرتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں بھی عورتوں کے حقوق کی پاسداری کی تاکید فرمائی ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے اسلامی ریاست میں خواتین کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری رہی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق خواتین کو حق رائے دہی، حصول تعلیم کا حق اور ملازمت کا اختیار حاصل ہے، لہذا خواتین کے تعلیمی اداروں کو تباہ کرنا اور خواتین اساتذہ اور طالبات پر حملے کرنا شریعت اسلامیہ اور قانون کے منافی ہے۔ نیز اسلامی تعلیمات کی رو سے غیرت کے نام پر قتل اور خواتین کے دیگر حقوق کی پامالی احکام شریعت میں سختی سے ممنوع ہے اور ان کی سخت سزا ہے۔ ریاست پاکستان کو اس قسم کی سرگرمیوں کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف کارروائی کا مکمل حق حاصل ہے۔

۲۱: لاؤڈ اسپیکر کے ہر طرح کے غیر قانونی استعمال کی ہر صورت میں حوصلہ شکنی کی جائے اور متعلقہ قانون پر من و عن عمل کیا جائے اور منبر و محراب سے جاری ہونے والے نفرت انگیز خطابات کو ریکارڈ کر کے ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے، نیز ٹیلیویژن

چینلوں پر مذہبی موضوعات پر مناظرہ بازی کو قانونا ممنوع اور قابل دست اندازی پولیس قرار دیا جائے۔

۲۲: الیکٹرانک میڈیا کے حق آزادی اظہار کو قانون کے دائرے میں لایا جائے اور اس کی حدود کا تعین کیا جائے۔

## خلاصہ کلام:

۱: دستور پاکستان ۱۹۷۳ء اسلامی اور جمہوری ہے اور یہ پاکستان کی تمام اکائیوں کے درمیان ایسا عمرانی معاہدہ ہے جس کو تمام مکاتب فکر کے علماء مشائخ کی حمایت حاصل ہے، اس لئے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کے تقاضوں کے مطابق پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کے منافی نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی اس دستور کی موجودگی میں کسی فرد یا گروہ کو ریاست پاکستان اور اس کے اداروں کے خلاف کسی قسم کی مسلح جدوجہد کا کوئی حق حاصل ہے۔

۲: نفاذ شریعت کے نام پر طاقت کا استعمال، ریاست کے خلاف مسلح محاذ آرائی نیز لسانی، علاقائی، مذہبی، مسلکی اختلافات اور قومیت کے نام پر تخریب و فساد اور دہشت گردی کی تمام صورتیں احکام شریعت کے خلاف ہیں اور پاکستان کے دستور و قانون سے بغاوت اور طاقت کے زور پر اپنے نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنے کی روش شریعت کے احکام کی مخالفت اور فساد فی الارض ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور و قانون کی رو سے ایک قومی اور ملی جرم بھی ہے۔ دفاع پاکستان اور استحکام پاکستان

کے لئے ایسی تمام تخریبی کاروائیوں کا خاتمہ ضروری ہے، اس لئے ان کے تدارک کے لئے بھرپور انتظامی، تعلیمی فکری اور دفاعی اقدامات کئے جائیں گے۔

۳: دستور پاکستان کے تقاضوں کے مطابق پاکستان معاشرے کی ایسی تشکیل جدید ضروری ہے جس کے ذریعے سے معاشرے میں منافرت، تنگ نظری، عدم برداشت اور بہتان تراشی جیسے بڑھتے ہوئے رجحانات کا خاتمہ کیا جاسکے۔ اور ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں برداشت و رواداری، باہمی احترام اور عدل وانصاف پر مبنی حقوق و فرائض کا نظام قائم ہو۔

فصل سوم:

# قرارداد مقاصد کا مکمل متن

(یہ قرار داد 12 مارچ 1949ء کو پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی۔ یہ قرار داد پاکستان کے آئین کے لیے رہنما اصول متعین کرتی ہے۔)

- اللہ تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے۔اس نے جمہور کے ذریعے مملکتِ پاکستان کو جو اختیار سونپا ہے،وہ اس کی مقررہ حدود کے اندر مقدس امانت کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔
- مجلس دستور ساز نے جو جمہور پاکستان کی نمائندہ ہے،آزاد و خود مختار پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔
- جس کی رو سے مملکت اپنے اختیارات واقتدار کو جمہور کے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔
- جس کی رو سے اسلام کے جمہوریت،حریت،مساوات،رواداری اور عدلِ عمرانی کے اصولوں کا پورا اتباع کیا جائے گا۔
- جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو قرآن و سنت میں درج اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق ترتیب دے سکیں۔

- جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی اہتمام کیا جائے گا کہ اقلیتیں، اپنے مذاہب پر عقیدہ رکھنے، عمل کرنے اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دینے کے لیے آزاد ہوں۔
- جس کی رو سے وہ علاقے جو اب تک پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں، ایک وفاق بنائیں گے *جس کے صوبوں کو مقررہ اختیارات واقتدار کی حد تک خود مختاری حاصل ہو گی۔
- جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی اور ان حقوق میں جہاں تک قانون واخلاق اجازت دیں، مساوات، حیثیت و مواقع کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی انصاف، اظہار خیال، عقیدہ، دین، عبادت اور جماعت کی آزادی شامل ہو گی۔
- جس کی رو سے اقلیتوں اور پسماندہ و پست طبقات کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے گا۔
- جس کی رو سے نظامِ عدل گستری کی آزادی پوری طرح محفوظ ہو گی۔
- جس کی رو سے وفاق کے علاقوں کی صیانت، آزادی اور جملہ حقوق، بشمول خشکی و تری اور فضا پر صیانت کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

تاکہ اہلِ پاکستان فلاح و بہبود کی منزل پا سکیں اور قوام عالم کی صف میں اپنا جائز و ممتاز مقام حاصل کریں اور امن عالم اور بنی نوع انسان کی ترقی و خوش حالی کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔

فصل چہارم:

# قومی ریاست اور جہاد

جدید قومی ریاست کے بارے میں ایک بہت بنیادی احساس جو روایتی مذہبی اذہان میں بہت شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے، یہ ہے کہ اس تصور کو قبول کرنا درحقیقت جہاد کی تنسیخ کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے جو اسلامی تصور حکومت واقتدار کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں مسلمان ریاست کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے، چند ضروری شرائط کے ساتھ، ارد گرد کے علاقوں میں قائم غیر مسلم حکومتوں کے خلاف جنگ کرکے یا تو ان کا خاتمہ کر دے اور ان علاقوں کو مسلمان ریاست کا حصہ بنالے یا کم سے کم انھیں اپنا تابع اور باج گزار بننے پر مجبور کر دے۔ قومی ریاست کے جدید تصور میں، ظاہر ہے، اس کی گنجائش نہیں، کیونکہ اپنی جغرافیائی حدود میں سیاسی خود مختاری کو ہر قومی ریاست کا بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے اور کسی ریاست کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی بھی بنیاد پر دوسری ریاست کی جغرافیائی حدود یا انتظام کار میں مداخلت کرے۔ یوں جہاد اور قومی ریاست میں گویا تباین کی نسبت پائی جاتی ہے۔

تاہم مذہبی فکر کو اس علمی حقیقت کا بھی ادراک ہے کہ موجودہ عہد میں معاشروں کی بقا سرتاسر قومی ریاست کے تصور پر منحصر ہے، اس لیے جہاں یہ سوال اہم ہے کہ قومی ریاست میں جہاد کا امکان باقی رہتا ہے یا نہیں، وہاں یہ سوال بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ اہمیت کا حامل

ہے کہ اگر قومی ریاست کے تصور کو کالعدم کر دیا جائے تو بحالات موجودہ معاشروں کی نفس بقا کیسے ممکن ہو گی۔ یہ معلوم ہے کہ دور جدید میں نہ صرف استعمار (یعنی طاقت کے زور پر بالادست قوموں کے کمزور قوموں پر مسلط ہونے کے عمل) کا خاتمہ قومی ریاست کے تصور کے تحت ہی ممکن ہوا ہے، بلکہ طاقتور قوموں کے باہمی جنگ وجدال اور خوں ریزی کا سلسلہ بھی اسی اصول کو قبول کر لینے کی بدولت ہی رکا ہوا ہے۔ مزید براں، طاقتور قوموں کے جوار میں قائم چھوٹے چھوٹے ممالک بھی اگر ایک سطح پر انفرادیت اور خود ارادی سے بہرہ ور اور اپنے زور آور پڑوسیوں کی براہ راست چیرہ دستی سے محفوظ ہیں تو اس کے پیچھے بھی قومی ریاست کے احترام کا ہی اصول کار فرما ہے۔ چنانچہ خدا نخواستہ آج اگر اس اصول کے حوالے سے بین الاقوامی اتفاق رائے ختم ہو جائے تو ایک نئی جنگ عظیم کا شروع ہو جانا ہفتوں یا دنوں کی نہیں، بلکہ لمحوں کی بات ہے اور اس سارے فساد میں خاص طور پر کمزور اور پس ماندہ قومیں جس تباہی سے دوچار ہوں گی، اس کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔

گویا فکر اسلامی کو ایک مخمصے کا سامنا ہے۔ اگر قومی ریاست کے تصور کو قبول نہیں کیا جاتا تو خود اس معاشرے کا قیام اور بقا ممکن نہیں جس نے جہاد کی ذمہ داری انجام دینی ہے، اور اگر کیا جاتا ہے تو مسلمان ریاست کی ایک بنیادی ذمہ داری یعنی جہاد سے دستبرداری کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ روایتی مذہبی فکر میں اس مخمصے کا عمومی طور پر قابل قبول حل یہ ہے کہ قومی ریاست کے تصور کو بادل نخواستہ اور بامر مجبوری ایک وقتی وعارضی طور صورت حال کے طور پر تو قبول کیا جائے، اور جب تک یہ عملی رکاوٹ موجود ہو، اس وقت تک جہاد پر عمل کو بھی مجبوراً معطل رکھا جائے، لیکن اسے کوئی مستقل اور معیاری اصول نہ مانا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ہی مسلمان حکومتیں اس پوزیشن میں آ جائیں کہ قومی ریاست کے تصور کو چیلنج کر سکیں تو وہ ایسا

ہی کریں اور طاقت وحوصلہ کے بل بوتے پر اسلام کی سیاسی بالادستی غیر مسلم قوموں پر قائم کرنے کے لیے جہاد کا آغاز کر دیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ یہ نقطہ نظر فقہ اسلامی کے ایک خاص فہم اور تعبیر پر مبنی ہے جس سے مختلف نقطہ نظر بھی موجود ہے۔ اس متوازی نقطہ نظر کے مطابق فقہ اسلامی میں غیر مسلم حکومتوں کے اصولی جواز کو تسلیم کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ لازماً جنگ جاری رکھنے کو مسلمان ریاست کا مقصد یا فریضہ قرار نہیں دیا گیا۔ تاہم سر دست ہم اس دوسرے نقطہ نظر پر بات نہیں کر رہے جس کی نوعیت دراصل دور جدید کے تناظر میں فقہی ذخیرے کی تعبیر نو کی ہے۔ یہاں ہماری گفتگو فقہ اسلامی کی روایتی اور کلاسیکی تعبیر کے تناظر میں ہے جس کی رو سے مسلمان اور غیر مسلم ریاستوں کے مابین اصل تعلق جنگ ہی کا ہے۔ اس زاویہ نظر سے جدید قومی ریاست، جہاد کی ذمہ داری کی ادائیگی میں ایک مانع کا درجہ رکھتی ہے اور، جیسا کہ واضح کیا گیا، اسے ایک وقتی اور عارضی کیفیت کے طور پر ہی قبول کیا جا سکتا ہے۔

تاہم یہ ایک فقہی اور قانونی انداز کا حل ہے جو ایک محدود دائرے میں قابل فہم ہے، لیکن صورت حال کی اصل پیچیدگی کو موضوع نہیں بناتا۔ اس پیچیدگی کے تین چار پہلو بہت بنیادی ہیں۔ ایک تو وہی جس کا اوپر ذکر کیا گیا، یعنی یہ کہ طاقت کے غیر معمولی عدم توازن کی موجودہ صورت حال میں قومی ریاست کے تصور کی نفی کا نتیجہ عملاً کس کے حق میں نکلے گا؟

دوسرا یہ کہ جدید دور میں قومی ریاست کے اصول سے انحراف کا تعلق طاقت اور استطاعت کی فراہمی یا عدم فراہمی سے ثانوی، جبکہ قانونی واخلاقی جواز سے بنیادی ہے۔ اس اصول پر دنیا کے اجتماعی اخلاقی ضمیر کا اجماع ہو چکا ہے اور کوئی طاقت ور سے طاقت ور حکومت بھی اس کی خلاف ورزی کرے تو اخلاقی اور قانونی طور پر اس کا جواز تسلیم نہیں کیا جاتا۔ جب تک اجتماعی انسانی شعور میں اس حوالے سے کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی اور، مثال کے طور پر، ماقبل

جدید ادوار کے سیاسی تصورات کے مطابق دوبارہ طاقت کو حق حکومت کی جائز بنیاد نہیں مان لیا جاتا، ایسا کوئی بھی اقدام اجتماعی انسانی ضمیر کی نظروں میں غیر اخلاقی اور غیر قانونی رہے گا۔ یہ صورت حال دور قدیم سے جوہری طور پر مختلف ہے جب سلطنتوں اور ریاستوں کے لیے توسیع حدود کو ایک جائز سیاسی حق تصور کیا جاتا تھا اور تسلط کے بالفعل قائم ہو جانے کے بعد غالب طاقت کو وہاں کا قانونی حاکم تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ اس اصول کو بین الاقوامی عرف کی حیثیت حاصل تھی، چنانچہ طاقت کے استعمال کا نتیجہ کامیابی کی صورت میں نکلنے کے بعد قانونی واخلاقی جواز کا سوال مستقل طور پر سر نہیں اٹھاتا رہتا تھا۔

اس پہلو کو یہ کہہ کر جھٹکا نہیں جا سکتا کہ مسلمان اپنے اقدامات کے لیے دنیا سے سند جواز حاصل کرنے کے پابند نہیں، ان کے لیے خدا کی شریعت کا حکم ہی کافی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مسئلہ صرف ابتداءاً سند جواز کی فراہمی کا نہیں، بلکہ عالمی اخلاقی عرف کے تناظر میں جواز کی مستقل sustainability کا ہے اور اس کے بارے میں یہ فرض کرنا کہ شریعت کو اس سے مطلقاً کوئی غرض نہیں یا یہ کہ وہ مسلمانوں کو عالمی رائے عامہ کے سامنے مستقلاً ایک اخلاقی ملزم سمجھے جانے کے امتحان میں ڈالنا چاہتی ہے، انتہائی سادہ فکری کا نتیجہ ہوگا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنی چاہیے کہ صرف سیاسی طاقت ہر سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ طاقت کے استعمال کو اخلاقی جواز درکار ہوتا ہے اور اس جواز کی بنیادیں انسانی ضمیر کی سطح پر مشترک ہونی چاہییں۔ اخلاقی جواز کے دائرے میں جزوی اور محدود سطح کے اختلافات، جن کا اثر وقتی اور عارضی ہو، کی تلافی تو طاقت سے کی جا سکتی ہے، لیکن طاقت کے زور پر اخلاقی نوعیت کے سوالات کو مستقلاً ایڈریس نہیں کیا جا سکتا۔

تیسرا انتہائی اہم پہلو وہ تبدیلیاں ہیں جو دور جدید میں جنگ کی نوعیت اور اسکی تباہ کاری کی صلاحیت میں رونما ہو چکی ہیں جیسا کہ معلوم ہے، آج کی جنگ صرف میدان جنگ تک

محدود نہیں رہی اور معیشت و اقتصاد پر اس کے عمومی اثرات کے علاوہ جنگی ہتھیار بھی مقاتل اور غیر مقاتل کی تفریق سے عاجز ہیں، بلکہ بہت سے ہتھیار تو بنائے ہی اس مقصد سے گئے ہیں کہ تباہی کا دائرہ صرف مقاتلین تک محدود نہ رہے۔ جنگ سے پھیلنے والی تباہی کا نشانہ سب سے زیادہ عام لوگ بنتے ہیں جو جنگ کا فیصلہ کرنے یا جنگی عمل کی انجام دہی میں شریک بھی نہیں ہوتے۔ جنگ کے بارے میں کلاسیکی اسلامی قانون کا تصور یہ ہے کہ یہ حسن لغیرہ ہے، یعنی انسانی خون بہانا اگرچہ فی نفسہ ایک قبیح چیز ہے، لیکن چونکہ اس پر قیام امن اور دفع فساد کا مقصد موقوف ہے، اسلیے ایک ذریعے کے طور پر اسمیں بالواسطہ اخلاقی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ دور جدید میں جنگ کی تباہ کاری کی نوعیت بدل جانے کے تناظر میں مذکورہ تصور کی معنویت بھی بدیہی طور پر برقرار نہیں رہی، اسلئے کہ حسن وقبح کی بحث میں تناسب کا سوال بنیادی ہوتا ہے۔ ایک قبیح چیز اسی وقت تک حسن لغیرہ ہو سکتی ہے جب تک اس سے پیدا ہونے والا ضرر، اس سے حاصل ہونے والے فائدے کے مقابلے میں کم ہو اور متوقع فائدے کے حصول کا امکان بھی غالب ہو۔ دور جدید کی جنگ میں، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، صورت حال بالکل برعکس ہے۔

ایک اور نہایت اہم سوال یہ ہے کہ جہاد کے ذریعے سے اسلامی ریاست کے رقبے کی توسیع کی پالیسی قدیم دور میں دار الاسلام اور دار الحرب کی جس تقسیم پر مبنی تھی، بذات خود وہ تقسیم جدید دور میں کتنی بامعنی رہ گئی ہے؟ جدید دور میں کم سے کم دو بنیادی تبدیلیوں نے اس معاملے کی نوعیت کو بالکل بدل دیا ہے: ایک، بڑے پیمانے پر انتقال آبادی اور دوسرے، شہری حقوق کا جدید سیاسی تصور۔ قدیم دور میں دنیا کے مسلمان، بنیادی طور پر اسلامی سلطنتوں کے حدود میں مقیم ہوتے تھے اور غیر مسلم حکومتوں کے دائرہ اختیار میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد کا تناسب نہ ہونے کے برابر تھا۔ جدید دور میں صورت حال بالکل مختلف ہے اور مختلف عوامل کے تحت مسلمانوں کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اب غیر مسلم ریاستوں میں سکونت

پذیر ہو چکا ہے۔ پھر یہ کہ بیشتر ممالک میں ان مسلمانوں کو ان مسلمانوں کی حیثیت اجنبی یا دوسرے درجے کے شہری کی نہیں، بلکہ انھیں مساوی مدنی وسیاسی حقوق سے بہرہ ور تسلیم کیا گیا ہے اور اس حیثیت سے انھیں اپنی تعداد اور معاشی صورت حال کے لحاظ سے ان ممالک کی پالیسیوں اور فیصلوں کی تشکیل میں شامل ہونے کا موقع بھی حاصل ہے۔ گویا غیر مسلم ممالک کے بارے میں یہ تصور کہ وہ اصولی طور پر غیر مسلموں کے ملک ہیں، اب اس طرح بامعنی نہیں رہا جیسا کہ ماضی میں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دور جدید کے فقہاء نے ایسی مسلمان کمیونٹیز کے مسائل واحکام پر گفتگو کے لیے فقہ الاقلیات کے عنوان سے ایک مستقل باب وضع کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے، جبکہ کلاسیکی فقہ میں اس موضوع پر چند منتشر جزئیات سے زیادہ کوئی راہ نمائی نہیں ملتی۔

صورت حال کی یہ تبدیلی قانون بین الممالک کے اساسی تصورات اور عملی ڈھانچے پر بھی براہ راست اثرات مرتب کرتی ہے اور بدیہی طور پر اس فریم ورک میں جہاد کے کلاسیکی تصور کو، جس میں فرض کردہ صورت واقعہ بالکل مختلف تھی، روبہ عمل نہیں کیا جاسکتا۔

یہ تمام پہلو ایک گہرے اور بنیادی نوعیت کے اجتہادی زاویہ نظر کا تقاضا کرتے ہیں اور فکر اسلامی کو اس حوالے سے سب سے اہم سوال یہ درپیش ہے کہ کیا حالات کے جبر اور اصول ضرورت کے علاوہ ان نئے سیاسی واخلاقی تصورات کے ساتھ تعامل کا کوئی علمیاتی اور اخلاقی زاویہ بھی ہو سکتا ہے جس میں ان تصورات کی داخلی قدر وقیمت یا عملی افادیت کو فیصلے کی بنیاد بنایا جاسکے؟ اگر ایسا ممکن ہے تو کیا یہ تصور جہاد کی تنسیخ کے ہم معنی ہوگا یا اس کی کوئی ایسی تعبیر بھی کی جاسکتی ہے جو شریعت کی آفاقیت اور جامعیت کے اسلامی عقیدے سے ہم آہنگ ہو؟ اتنا بہرحال واضح ہے کہ سوالات فلسفیانہ اور اصولی نوعیت کے ہیں۔ جزوی وفقہی نوعیت کا انداز نظر ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے کافی نہیں ہے

باب ہفتم

# آئین پاکستان پر معترضین کے شبہات کا تنقیدی جائزہ

# آئین پاکستان پر وارد کیے جانے والے شبہات کا خلاصہ

عہدِ حاضر میں مختلف مذہبی حلقوں کی طرف سے آئینِ پاکستان کے غیر اسلامی ہونے پر جو اعتراضات وارد کیے گئے ہیں، ان میں سے بنیادی اور اہم اعتراضات درج ذیل ہیں:

- آئین میں بعض اشخاص اور اداروں کو قانونی محاسبہ سے بالاتر رکھا گیا ہے۔
- آئین کی رو سے سربراہ ریاست کو کسی بھی جرم پر سزائے موت کو معاف کرنے کا اختیار حاصل ہے۔
- آئین میں قاضی کے لیے عادل ہونے کی شرط نہیں لگائی گئی، جبکہ مسلمان ہونے کی شرط صرف شرعی عدالت کے قاضی کے لیے لگائی گئی ہے۔
- آئین میں سربراہ ریاست کے لیے مرد ہونے کی شرط نہیں لگائی گئی۔
- ایسے افراد کو سزا سے تحفظ فراہم کیا گیا ہے جنھوں نے اس فعل کو قانونی طور پر جرم قرار دیے جانے سے پہلے اس جرم کا ارتکاب کیا ہو۔
- ایک جرم پر دو مرتبہ سزا دینے کی ممانعت کی گئی ہے۔
- آئین میں سود کے خاتمے کا صرف وعدہ کیا گیا ہے جس پر آج تک عمل نہیں ہوا۔

معترضین کا کہنا ہے کہ مذکورہ تمام امور شریعت کے خلاف ہیں اور کسی بھی خلاف شریعت امر کو قانون کا درجہ دینا کفر ہے، اس لیے مذکورہ امور کو آئین کا حصہ بنانا اسے ایک کفریہ آئین کا درجہ دے دیتا ہے۔ اب ہم ان میں سے اہم ترین شبہات کو ذیل میں قدرے تفصیل کے ساتھ درج کرتے ہیں:

## ۱: آئین میں ارکان پارلیمان کو مطلق ترمیم کا حق

آئین پاکستان ارکان پارلیمان کو مطلق طور پر کسی بھی شق میں ترمیم کا حق دیتا ہے، اور چونکہ یہاں بظاہر ایسی کوئی قید نہیں لگائی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کی بالادستی کو تسلیم کرنے اور قانون سازی میں شریعت کی پابندی کی شقوں میں ترمیم کرنے کی مجاز نہیں ہے، اس لیے اپنے اطلاق کے لحاظ سے یہ آئین پارلیمنٹ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ چاہے تو شریعت کی بالادستی کو تسلیم کرنے سے بھی انکار کر سکتی ہے۔

**جواب:** ہم نے تکفیر کا جو پہلا اصول بیان کیا ہے، اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ استدلال سرے سے بے بنیاد ہے۔ سیدھا سا سوال ہے کہ کیا آئین میں ترمیم کا حق دینے والی اس شق کی جو تعبیر اس اعتراض میں پیش کی گئی ہے، وہی اس کی واحد ممکنہ تعبیر ہے یا اس کے علاوہ بھی کوئی تعبیر ممکن ہے جو اسے کفر سے بچاتی ہو؟ ہمارے علم کی حد تک پاکستان کی آئینی تاریخ میں اس شق کا یہ مطلب سب سے پہلے شدت پسندوں نے پیش کیا ہے، جبکہ علما، ججز اور قانون دان طبقے میں سے کسی نے بھی اس سے یہ مفہوم اخذ نہیں کیا۔ یہ ایک سادہ اصول ہے کہ کسی بھی دستاویز کے کسی جز کا منشا و مراد اس دستاویز کے اصولی و نظری مفروضات، مجموعی مزاج اور دستاویز میں شامل دیگر تصریحات کو نظرانداز کر کے متعین نہیں کیا جا سکتا۔ آئین یہ تصریح کرتا ہے کہ اسے ایک اسلامی مملکت کے منتخب نمائندے اس مقصد کے لیے وضع کر رہے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس ملک کے اجتماعی نظام کو اللہ اور اس کے رسول کی منشا کے مطابق چلایا جا سکے۔ گویا مسلمان ہونا اور اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات کی پابندی کو قبول کرنا آئین کا بنیادی مفروضہ ہے، جبکہ اس کی کسی بھی شق کے محض ظاہری الفاظ کے اطلاق سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ آئین کو تشکیل دینے والے

اپنے لیے قرآن وسنت کی بالادستی کے انکار کی گنجائش بھی آئین میں رکھنا چاہتے ہیں، اس بنیادی مفروضے کے بالکل خلاف ہے۔

## ۲: خاتمۂ سود کے وعدے کا عدم ایفا:

سود کے حوالے سے ایک اعتراض آئین کی دفعہ ۳۸ کو کفر قرار دینے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ دفعہ کہتی ہے کہ عوام کی معاشی اور معاشرتی فلاح وبہبود کی خاطر جس قدر جلد ممکن ہو، سود کو ختم کیا جائے گا۔ اب اس دفعہ کو مثبت ذہن سے دیکھا جائے تو یہ آئین کی اسلامیت کا اظہار کرتی ہے کہ اس میں سود کے خاتمے کو مقصد قرار دیا گیا ہے، البتہ چونکہ اسے پورے نظام سے فوری طور پر ختم کرنا ممکن نہیں، اس لیے اسے حالات کی سازگاری پر چھوڑ دیا گیا ہے ۔

اگر معترضین یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سود کے خاتمے کے لیے مہلت دینا اور تدریج کا طریقہ اختیار کرنا کفر ہے، تو پھر یہ مسئلہ ایک نازک اصولی بحث سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اگر وہ واقعی عملی حکمت ومصلحت کے لحاظ سے کسی فرد یا گروہ یا معاشرے کو احکام شریعت کا پابند بنانے میں تدریج کے طریقے کو کفر سمجھتے ہیں تو پھر انھیں اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے مطالبے پر یہ رخصت کیوں دی تھی کہ وہ سر دست صرف دو نمازیں ادا کر لیا کرے؟ [13] اسی طرح آپ نے بنو ثقیف سے اسلام کی بیعت لیتے ہوئے ان کی یہ شرط کیوں قبول کی کہ وہ زکوۃ نہیں دیں گے اور جہاد بھی نہیں کریں گے؟ آپ نے فرمایا کہ جب وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہو جائیں گے تو زکوۃ بھی دینے لگیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ [14]

---

[13] (الآحاد والمَثاني، رقم ۹۴۱۔أُسْدُ الغَابة، ۴۷۵۶)

[14] (سُنَن أبي داود: رقم ۳۲۰۵)

## ۳: صدر، وزیر اعظم اور دیگر کلیدی حکومتی عہدے داروں کا محاسبہ سے استثنا:

آئین کی دفعہ ۴ صدر کے کسی کو جواب دہ نہ ہونے کے معاملے کو واضح طور پر ان مخصوص معاملات تک محدود کرتی ہے، جن میں اسے آئین کی رو سے صوابدیدی اختیار حاصل ہو، جبکہ اس کے علاوہ باقی امور کی انجام دہی میں صدر کو کابینہ یا وزیر اعظم کے مشورے کا پابند بنایا گیا ہے۔

یہی صورت حال آئین کی دفعہ ۱۴۸ کی ہے جو صدر، وزیر اعظم، گورنر، وزرائے اعلی اور وفاقی وصوبائی وزرا کو ان افعال کے لیے عدالتی جواب دہی سے مستثنیٰ قرار دیتی ہے، جو انھوں نے اپنے حکومتی فرائض کی انجام دہی کے دوران میں کیے ہوں۔ اس پر یہ اعتراض ہے کہ یہ دفعہ شریعت سے صراحتاً متصادم ہے، اور شریعت کی مخالفت کو قانون کی شکل دینا کفر ہے، اگرچہ وہ مخالفت بذات خود صرف فسق ہی ہو۔

آئین کی یہ دفعہ مذکورہ حکومتی عہدے داروں کو مطلقا محاکے اور محاسبے سے نہیں، صرف عدالتی محاسبے سے مستثنیٰ قرار دے رہی ہے اور اسکے پس منظر میں ان کے قانون سے بالاتر ہونے کا تصور نہیں، بلکہ نظام حکومت کو چلانے میں مختلف اداروں کو ایک دوسرے کے دائرۂ کار میں بے جا مداخلت سے روکنا ہے۔ یہ انتظام اسلئے کیا گیا ہے کہ اگر حکمرانوں کو عدالتی محاسبہ سے مستثنیٰ نہ رکھا جائے، تو ان کے لیے روزمرہ کے انتظامی اور حکومتی معاملات چلانا بھی دشوار ہو جائیگا۔ اس سے ملتی جلتی ایک نظیر خود اسلامی فقہ میں موجود ہے، چنانچہ امام ابو حنیفہ ایک خاص قانونی نکتے کی روشنی میں اس بات کے قائل ہیں کہ ریاست کا سربراہ اعلیٰ اگر کسی قابل حد جرم مثلاً زنا، چوری وغیرہ کا مرتکب ہو تو اس کا مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ کمال الدین ابن الہمامؒ لکھتے ہیں:

وكلُّ شيءٍ فعله الإمامُ الذي ليسَ فوقَه إمامٌ مما يجبُ به الحدُّ كالزِّنا والشربِ والقذْفِ والسرقةِ لا يؤاخَذُ به إلا القصاص والمال... لأن الحد حق الله تعالى وهو

المكلف بإقامته وتعذر إقامته على نفسه لأن إقامته بطريق الحزي والنكال، ولا يفعل أحدٌ ذلك بنفسه، ولا ولاية لأحدٍ عليه ليستَوفِيَه [15]

"قصاص اور مالی بدعنوانی کے علاوہ ہر ایسا قابل حد جرم جس کا ارتکاب وہ حکمران کرے جس کے اوپر کوئی حکمران نہیں، جیسا کہ زنا، شراب نوشی، قذف اور چوری، اس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ حد، حق اللہ ہے اور حاکمِ اعلی ہی حدود کو (رعیت پر) قائم کرنے کا مکلف ہے۔ اس کا خود اپنی ذات پر حد قائم کرنا متعذر ہے کیوں کہ حد تو رسوائی اور عبرت کے طریقے پر قائم کی جاتی ہے اور کوئی شخص خود اپنے ساتھ یہ سلوک نہیں کر سکتا، جبکہ کسی دوسرے کو اس پر ولایت (قانونی اختیار) حاصل نہیں کہ وہ اس پر حد نافذ کر سکے"۔

اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن بہر حال یہ ائمہ مجتہدین میں سے ایک مسلمہ اور مستند امام کی رائے ہے، اور اسی وجہ سے اسے کفر قرار دینا اتنا آسان نہیں۔

## ۴: سربراہی کے لیے مرد اور قاضی کے لیے اسلام اور عدالت کی شرط:

**جواب:** سربراہ ریاست کے مرد ہونے اور قاضی کے مسلمان اور عادل ہونے کی شرائط اپنی جگہ اہمیت رکھنے کے باوجود ایسی نہیں ہیں کہ آئین میں ان کو شامل نہ کیے جانے کو کفر کے ہم معنی قرار دیا جائے۔ قاضی کے مسلمان اور عادل ہونے کی شرائط فقہا کی استنباط کردہ ہیں اور قرآن یا حدیث کی کسی نص میں واضح طور پر قاضی کے لیے ان شرائط کو لازم نہیں کہا گیا۔ حکمران کے مرد ہونے کی شرط نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک تبصرے سے اخذ کی گئی ہے جو آپ نے اہل فارس کے کسری کی بیٹی کو حکمران بنانے پر کیا تھا۔ اصول فقہ کی رو سے اس ارشاد کو براہ راست حرمت کا بیان نہیں

[15] (فتح القدير:٢٧٧٥)

کہا جا سکتا، اس لحاظ سے یہ شرط بھی بنیادی طور پر استنباطی ہے۔ مزید برآں ماضی قریب میں برصغیر کے ایک جید فقیہ اور عالم مولانا اشرف علی تھانوی یہ نقطۂ نظر پیش کر چکے ہیں کہ اس ممانعت کی اصل علت عورت کی رائے پر حتمی اور کلی انحصار ہے، اس لیے جمہوری نظام حکومت میں، جہاں حکمران اپنے فیصلوں کے لیے اصولی طور پر پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے، عورت کے حاکم بننے پر پابندی نہیں۔ چنانچہ آئین میں مذکورہ شرائط میں سے کسی بھی شرط کو شامل نہ کرنا شریعت کے نہیں، بلکہ شریعت کی ایک خاص اجتہادی واستنباطی تعبیر کے خلاف ہے جسے کسی بھی لحاظ سے کفر سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

## ۵: سربراہ مملکت کے لیے جرم کی معافی کا صوابدیدی اختیار:

**جواب:** سربراہ مملکت کے لیے کسی بھی جرم میں سزائے موت کو معاف کر دینے یا اس میں تخفیف کرنے کا اختیار صرف ایک ایسا نکتہ ہے جسے فی الواقع آئین میں شریعت کے ساتھ تصادم کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ قصاص کے مقدمات کے علاوہ عمومی طور پر سربراہ مملکت کے لیے یہ اختیار شریعت کے کسی صریح حکم کے ساتھ متصادم نہیں، اگرچہ اس پر بعض دیگر سوالات اٹھائے جا سکتے ہیں، البتہ قصاص کے مقدمے میں سزائے موت کی معافی از روے شریعت مقتول کے ورثا کی رضامندی کے ساتھ مشروط ہے، جس کا اس دفعہ میں لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس اعتبار سے اس شق کو جزوی طور پر شریعت کے منافی کہا جا سکتا ہے، تاہم تکفیر کے پہلے اصول کے تحت اس کو کفر سے تعبیر کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ اول تو آئین وضع کرنے والوں کے نیت اور ارادے کے بارے میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انھوں نے اس شق کے الفاظ کو قصداً اور ارادتاً جانتے ہوئے عام رکھا ہے کہ اس کا نتیجہ شریعت کی ایک ہدایت کی خلاف ورزی کی صورت میں نکل رہا ہے۔ ایسا بالکل ممکن ہے کہ یہ شق آئین میں درج کرتے ہوئے اس کا یہ اطلاقی پہلو کہ بعض صورتوں میں یہ

اختیار شریعت کے منافی ہے، سرے سے بنانے والوں کے سامنے ہی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ توجہ نہ ہونے کی بناپر نادانستہ ایسی کوئی بات کہہ دینے سے ہر گز کفر لازم نہیں آتا۔ پھر یہ کہ آئین کی اس شق کے بارے میں عدالتی سطح پر یہ باقاعدہ بحث رہی ہے کہ آئین کی ان شقوں کی موجودگی میں جو شریعت کی بالادستی کی ضمانت دیتی ہیں، زیر بحث شق قابل عمل اور قابل نفاذ بھی ہے یا نہیں۔

اس ضمن میں حاکم خان کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کا حوالہ دیا جاتا ہے جس میں قرار دیا گیا ہے کہ آئین کی یہ دونوں شقیں مساوی درجہ رکھتی ہیں اور کوئی ایک شق دوسری کو کالعدم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ تاہم یہ واضح ہے کہ آئین کی تعبیر کے حوالے سے یہ رائے کوئی اتنی واضح اور قطعی نہیں کہ اس سے مختلف کسی تعبیر کا امکان ہی نہ ہو اور اسی نکتے کے حوالے سے ہائی کورٹ اس کے برعکس یہ رائے دے چکی ہے کہ اسلامی شریعت کی بالادستی کی دفعہ دیگر دفعات پر بالادستی رکھتی ہے۔ اگرچہ عملی طور پر اس معاملے میں سپریم کورٹ کی تعبیر موثر ہے، لیکن ہائی کورٹ کے فیصلے سے یہ بات بہر حال واضح ہے کہ علمی طور پر اس سے مختلف تعبیر کا امکان موجود ہے۔ پھر یہ کہ اس شق کے حوالے سے تمام تر قانونی بحث کا حاصل صرف یہ ہے کہ آئین میں قرآن وسنت کی بالادستی کی جو ضمانت دی گئی ہے، اس کے حوالے سے ایک ایسی الجھن موجود ہے جو "تکنیکی" طور پر اس بات سے مانع ہے کہ عدالتیں آئین کی اس شق کی بنیاد پر قرآن وسنت کے منافی کسی حکم کو کالعدم قرار دیں، نہ یہ کہ اس ضمانت کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں، جیسا کہ مخالفین اس سے یہ نتیجہ اخذ کر کے آئین کو "کافرانہ" ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حاکم خان کیس میں عدالت نے اس نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس تکنیکی الجھن کے حل کے لیے عدالت عالیہ کی طرف نہیں، بلکہ پارلیمنٹ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

(ماخوذ از الشریعہ جہاد نمبر و دیگر معاون کتب)

باب ہشتم

# اسلامی حکومت کے بنیادی اُصول
# ۱۹۵۱ میں جملہ مکاتبِ فکر کے متفقہ نکات

مدتِ دراز سے اسلامی دستورِ مملکت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام کا کوئی دستور مملکت ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے اُصول کیا ہیں اور اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ اور کیا اُصول اور عملی تفصیلات میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جس پر مختلف اسلامی فرقوں کے علما متفق ہو سکیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق عام طور پر ایک ذہنی پریشانی پائی جاتی ہے اور اس ابہام میں ان مختلف آئینی تجاویز نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے جو مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے نام پر وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام اسلامی فرقوں کے چیدہ اور معتمد علما کی ایک مجلس منعقد کی جائے اور وہ بالاتفاق صرف اسلامی آئین کے بنیادی اُصول ہی بیان کرنے پر اکتفانہ کرے، بلکہ ان اُصولوں کے مطابق ایک ایسا دستوری خاکہ بھی مرتب کر دے جو تمام اسلامی فرقوں کے لیے قابل قبول بھی ہو۔

اس غرض کے لیے کراچی میں بتاریخ ۱۴، ۱۳، ۱۲ اور ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ بمطابق ۲۲، ۲۱، ۲۳ اور ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء بصدارت مولانا سید سلیمان ندوی ایک اجتماع منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں اسلامی آئین کے جو بنیادی اُصول بالاتفاق طے ہوئے وہ درج ذیل ہیں:

## اسلامی مملکت کے بنیادی اُصول

اسلامی مملکت کے آئین میں حسبِ ذیل اُصول کی تصریح لازمی ہے:

1. اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔
2. ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو گا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا، جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

3. (تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب و سنت کے خلاف ہو، تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک مُعیَّنہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیے جائیں گے۔

4. مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اُصول و مقاصد پر مبنی ہو گی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

5. اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کر کے منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلامی کے احیا واعلا اور مُسلّمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

6. اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ مسلمانان عالم کے ساتھ رشتۂ اتحاد و اخوّت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی و لسانی علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

7. مملکت بلاامتیازِ مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہو گی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں، یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیِ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

8. باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت،

آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہارِ رائے، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

9. مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقعہ، صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

10. مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انھیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انھیں کے قاضی یہ فیصلہ کریں۔

11. غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انھیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

12. غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدودِ شریعت کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں، ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

13. رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدیُّن، صلاحیت اور اِصابتِ رائے پر ان کے جمہوری منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

14. رئیس مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا۔ البتہ وہ اپنے خیالات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

15. رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں، بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکانِ حکومت اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

16. رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ آئین کو کُلاً یا جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

17. جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی، وہی کثرتِ آرا سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

18. رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

19. ارکان و عمال حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

20. محکمہ عدلیہ، محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا، تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

21. ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی، جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

22. ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکت واحدہ کے اجزائے انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسل، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں محض انتظامی علاقوں کی ہوگی، جنھیں انتظامی

سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا۔ مگر انھیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

23. آئین کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔

## اسمائے گرامی حضرات شرکائے مجلس

1. (علامہ) سلیمان ندوی (صدر مجلس ہذا)
2. (مولانا) سید ابوالاعلیٰ مودودی (امیر جماعت اسلامی پاکستان)
3. (مولانا) شمس الحق افغانی (وزیر معارف، ریاست قلات)
4. (مولانا) محمد بدر عالم (اُستاذ الحدیث، دارالعلوم الاسلامیہ اشرف آباد، ٹنڈو الہ یار، سندھ)
5. (مولانا) احتشام الحق تھانوی (متہم دارالعلوم الاسلامیہ اشرف آباد، سندھ)
6. (مولانا) محمد عبدالحامد قادری بدایونی (صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان، سندھ)
7. (مفتی) محمد شفیع (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام مجلس دستور ساز پاکستان)
8. (مولانا) محمد ادریس (شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ، بہاولپور)
9. (مولانا) خیر محمد (متہم، مدرسہ المدارس، ملتان شہر)
10. (مولانا مفتی) محمد حسن (متہم مدرسہ اشرفیہ، نیلا گنبد، لاہور)
11. (پیر صاحب) محمد امین الحسنات (مانکی شریف، سرحد)
12. (مولانا) محمد یوسف بنوری (شیخ التفسیر، دارالعلوم الاسلامیہ، اشرف آباد، سندھ)
13. (حاجی) خادم الاسلام محمد امین (خلیفہ حاجی ترنگ زئی، المجاہد آباد، پشاور صوبہ سرحد)
14. (قاضی) عبدالصمد سربازی (قاضی قلات، بلوچستان)

15. (مولانا)اطہر علی(صدر عامل جمعیۃ علمائے اسلام، مشرقی پاکستان)
16. (مولانا)ابو جعفر محمد صالح(امیر جمعیت حزب اللہ، مشرقی پاکستان)
17. (مولانا)راغب احسن(نائب صدر جمعیۃ العلما اسلام، مشرقی پاکستان)
18. (مولانا)محمد حبیب الرحمن(نائب صدر جمعیۃ المدرسین، سرسینہ شریف، مشرقی پاکستان)
19. (مولانا)محمد علی جالندھری(مجلس احرارِ اسلام پاکستان)
20. (مولانا)داؤد غزنوی(صدر جمعیۃ اہلحدیث، مغربی پاکستان)
21. (مفتی)جعفر حسین مجتہد(رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)
22. (مفتی حافظ)کفایت حسین مجتہد(ادارہ عالیہ تحفظِ حقوقِ شیعہ پاکستان لاہور)
23. (مولانا)محمد اسماعیل سلفی(ناظم جمعیت اہلحدیث پاکستان گوجرانوالہ)
24. (مولانا)حبیب اللہ(جامعہ دینیہ دار الہدیٰ، ٹیڑھی، خیر پور میر)
25. (مولانا)احمد علی(امیر انجمن خدام الدین، شیرانوالہ دروازہ، لاہور)
26. (مولانا)محمد صادق(مہتمم مدرسہ مظہر العلوم، کھڈہ، کراچی)
27. (پروفیسر)عبد الخالق(رکن بورڈ آف تعلیماتِ اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)
28. (مولانا)شمس الحق فرید پوری(صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم، ڈھاکہ)
29. (مفتی)محمد صاحبداد عفی عنہ(سندھ مدرسۃ الاسلام، کراچی)
30. (مولانا)محمد ظفر احمد انصاری(سیکرٹری بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)
31. (پیر صاحب)محمد ہاشم مجددی(ٹنڈو سائیں داد، سندھ)

باب نہم

# ووٹ کی شرعی حیثیت

## ووٹ کی شرعی حیثیت

آج کی دنیا میں اسمبلیوں، کونسلوں، میونسپل وارڈوں اور دوسری مجالس اور جماعتوں کے انتخابات میں جمہوریت کے نام پر جو کھیل کھیلا جارہا ہے کہ زور وزر اور غنڈا گردی کے سارے وسائل کا استعمال کرکے یہ چند روزہ موہوم اعزاز حاصل کیا جاتا ہے اور اس کے عالم سوز نتائج ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہیں اور ملک و ملت کے ہمدرد و سمجھ دار انسان اپنے مقدور بھر اس کی اصلاح کی فکر میں بھی ہیں، لیکن عام طور پر اس کو ایک ہار جیت کا کھیل اور خالص دنیاوی دھندا سمجھ کر ووٹ لیے اور دیے جاتے ہیں۔ لکھے پڑھے دین دار مسلمانوں کو بھی اس طرف توجہ نہیں ہوتی کہ یہ کھیل صرف ہماری دنیا کے نفع نقصان اور آبادی یا بربادی تک نہیں رہتے، ابلکہ اس کے پیچھے کچھ طاعت و معصیت اور گناہ و ثواب بھی ہے جس کے اثرات اس دنیا کے بعد بھی یا ہمارے گلے کا ہار عذابِ جہنم بنیں گے، یا پھر درجاتِ جنت اور نجاتِ آخرت کا سبب بنیں گے۔

اگرچہ آج کل اس اکھاڑے کے پہلوان اور اس میدان کے مرد، عام طور پر وہی لوگ ہیں جو فکرِ آخرت اور خدا اور رسولؐ کی طاعت و معصیت سے مطلقاً آزاد ہیں اور اس حالت میں اُن کے سامنے قرآن و حدیث کے احکام پیش کرنا ایک بے معنی و عبث فعل معلوم ہوتا ہے، لیکن اسلام کا ایک یہ بھی معجزہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوتی۔ ہر زمانے اور ہر جگہ کچھ لوگ حق پر قائم رہتے ہیں جن کو اپنے ہر کام میں حلال و حرام کی فکر اور خدا اور رسولؐ کی رضاجوئی پیش نظر رہتی ہے۔ نیز قرآن کریم کا یہ بھی ارشاد ہے: وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ o (الذّٰریٰت ۵۵:۵۱) یعنی آپ نصیحت کی بات کہتے رہیں کیونکہ نصیحت مسلمانوں کو نفع دیتی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ انتخابات میں اُمیدواری اور ووٹ کی شرعی حیثیت اور اُن کی اہمیت کو

قرآن وسنت کی رُو سے واضح کر دیا جائے۔ شاید کچھ بندگانِ خدا کو تنبیہ ہو اور کسی وقت یہ غلط کھیل صحیح بن جائے۔

## امیدوار

کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لیے جو اُمیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہو وہ گویا پوری ملت کے سامنے دو چیزوں کا مدعی ہے۔ ایک یہ کہ وہ اس کام کی قابلیت رکھتا ہے جس کا اُمیدوار ہے، دوسرے یہ کہ وہ دیانت وامانت داری سے اس کام کو انجام دے گا۔ اب اگر واقعی میں وہ اپنے اس دعوے میں سچا ہے، یعنی قابلیت بھی رکھتا ہے اور امانت و دیانت کے ساتھ قوم کی خدمت کے جذبے سے اس میدان میں آیا تو اس کا یہ عمل درست ہے۔ البتہ بہتر طریق اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو، بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کو اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کر دے اور جس شخص میں اس کام کی صلاحیت ہی نہیں، وہ اگر اُمیدوار ہو کر کھڑا ہو تو قوم کا غدار اور خائن ہے۔ اس کا ممبری میں کامیاب ہونا ملک و ملت کے لیے خرابی کا سبب تو بعد میں بنے گا، پہلے تو وہ خود غدار و خیانت کا مجرم ہو کر عذابِ جہنم کا مستحق بن جائے گا۔ اب ہر وہ شخص جو کسی مجلس کی ممبری کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اگر اس کو کچھ آخرت کی بھی فکر ہے تو اس میدان میں آنے سے پہلے خود اپنا جائزہ لے لے اور یہ سمجھ لے کہ اس ممبری سے پہلے تو اس کی ذمہ داری صرف اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال ہی تک محدود تھی، کیونکہ حدیث کے مطابق ہر شخص اپنے اہل و عیال کا ذمہ دار ہے اور اب کسی مجلس کی ممبری کے بعد جتنی خلقِ خدا کا تعلق اس مجلس سے وابستہ ہے، اُن سب کی ذمہ داری کا بوجھ اُس کی گردن پر آتا ہے اور وہ دنیا و آخرت میں اس ذمہ داری کا مسؤول اور جواب دہ ہے۔

## ووٹ اور ووٹر کی مختلف حیثیتیں:

کسی اُمیدوار ممبری کو ووٹ دینے کی از روئے قرآن و حدیث چند حیثیتیں ہیں۔

## ووٹر کی پہلی حیثیت: شہادت

ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے، اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت بھی رکھتا ہے اور دیانت اور امانت بھی۔ اور اگر واقعی میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور ووٹر یہ جانتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے، جو سخت کبیرہ گناہ اور وبالِ دنیا و آخرت ہے۔ بخاری کی حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادتِ کاذبہ کو شرک کے ساتھ کبائر میں شمار فرمایا ہے (مشکوٰۃ) اور ایک دوسری حدیث میں جھوٹی شہادت کو اکبر کبائر فرمایا ہے (بخاری و مسلم)۔ جس حلقے میں چند اُمیدوار کھڑے ہوں اور ووٹر کو یہ معلوم ہے کہ قابلیت اور دیانت کے اعتبار سے فلاں آدمی قابل ترجیح ہے تو اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو ووٹ دینا اس اکبر کبائر میں اپنے آپ کو مبتلا کرنا ہے۔ اب ووٹ دینے والا اپنی آخرت اور انجام کو دیکھ کر ووٹ دے، محض رسمی مروت یا کسی طمع وخوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس وبال میں مبتلا نہ کرے۔

## دوسری حیثیت: سفارش

یعنی کہ ووٹر اس امیدوار کی نمائندگی کی سفارش کرتا ہے۔ اس سفارش کے بارے میں قرآن کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (النساء ۸۵:۴)

یعنی (جو شخص اچھی سفارش کرتا ہے اُس میں اس کو بھی حصہ ملتا ہے اور بُری سفارش کرتا ہے تو اُس کی بُرائی میں اُس کا بھی حصہ لگتا ہے)۔

اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے جو خلقِ خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے، اور بُری سفارش یہ ہے کہ نااہل، نالائق، فاسق و ظالم کی سفارش کر کے اُس کو خلقِ خدا پر مسلط کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا اُمیدوار اپنے پنج سالہ دور میں جو نیک یا بد عمل کرے گا ہم بھی اس کے شریک سمجھے جائیں گے۔

## تیسری حیثیت: وکالت

ووٹ کی ایک تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس اُمیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت اس کے کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا تو اُس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا، مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اُس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اس لیے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لیے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے: ایک شہادت، دوسری سفارش، تیسری حقوق مشترکہ میں وکالت۔ تینوں حیثیتوں میں جس طرح نیک، صالح، قابل آدمی کو ووٹ دینا موجبِ ثوابِ عظیم ہے اور اُس کے ثمرات اُس کو ملنے والے ہیں، اسی طرح نااہل یا غیر متدین شخص کو ووٹ دینا جھوٹی شہادت بھی ہے اور بُری سفارش بھی اور ناجائز وکالت بھی اور اس کے تباہ کن اثرات بھی اُس کے نامۂ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

## ضروری تنبیہ

مذکور الصدر بیان میں جس طرح قرآن وسنت کی رُو سے یہ واضح ہوا کہ نااہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہِ عظیم ہے، اسی طرح ایک اچھے، نیک اور قابل آدمی کو ووٹ دینا ثوابِ عظیم ہے بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے۔ قرآن کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے، اسی طرح سچی شہادت کو واجب ولازم بھی فرمادیا ہے۔ارشاد باری ہے:

كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ۵:۸)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے: كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ (النساء۴:۱۳۵) ان دونوں آیتوں میں مسلمانوں پر فرض کیا ہے کہ سچی شہادت سے جان نہ چرائیں، اللہ کے لیے ادائیگیِ شہادت کے واسطے کھڑے ہو جائیں۔ تیسری جگہ سورۂ طلاق (۶۵:۱) میں ارشاد ہے:

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ، یعنی اللہ کے لیے سچی شہادت کو قائم کرو۔ایک آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ سچی شہادت کا چھپانا حرام اور گناہ ہے۔ارشاد ہے: وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهادَةَ، وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (البقرہ۲:۲۸۳) (یعنی شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو چھپائے گا اُس کا دل گناہ گار ہے)۔

ان تمام آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا ہے کہ سچی گواہی سے جان نہ چرائیں، ضرور ادا کریں۔ آج جو خرابیاں انتخابات میں پیش آرہی ہیں اُن کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ نیک اور صالح حضرات عموماً ووٹ دینے ہی سے گریز کرنے لگے جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا جو مشاہدے میں آرہا ہے کہ ووٹ عموماً اُن لوگوں کے آتے ہیں جو چند ٹکوں میں خرید لیے جاتے ہیں اور اُن لوگوں کے ووٹوں سے جو نمائندے پوری قوم پر مسلط ہوتے ہیں، وہ ظاہر ہے کہ کس قماش اور کس کردار کے لوگ ہوں گے۔ اس لیے جس حلقے میں کوئی بھی اُمیدوار قابل اور نیک معلوم ہو، اُسے ووٹ

دینے سے گریز کرنا بھی شرعی جرم اور پوری قوم و ملت پر ظلم کے مترادف ہے، اور اگر کسی حلقے میں کوئی بھی اُمیدوار صحیح معنی میں قابل اور دیانت دار نہ معلوم ہو مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیتِ کار اور خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو تو تقلیلِ شر اور تقلیلِ ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دے دینا جائز بلکہ مستحسن ہے، جیسا کہ نجاست کے پورے ازالے پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں تقلیلِ نجاست کو اور پورے ظلم کو دفع کرنے کا اختیار نہ ہونے کی صورت میں تقلیلِ ظلم کو فقہاء رحمہم اللہ نے تجویز فرمایا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

خلاصہ یہ ہے کہ انتخابات میں ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام، اس پر کوئی معاوضہ لینا بھی حرام، اس میں محض ایک سیاسی ہار جیت اور دنیا کا کھیل سمجھنا بڑی بھاری غلطی ہے۔ آپ جس اُمیدوار کو ووٹ دیتے ہیں، شرعاً آپ اس کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نظریے اور علم و عمل اور دیانت داری کی رُو سے اس کام کا اہل اور دوسرے اُمیدواروں سے بہتر ہے جس کام کے لیے یہ انتخابات ہو رہے ہیں۔

**خلاصۂ بحث:**

اس حقیقت کو سامنے رکھیں تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ آپ کے ووٹ اور شہادت کے ذریعے جو نمایندہ کسی اسمبلی میں پہنچے گا، وہ اس سلسلے میں جتنے اچھے یا بُرے اقدامات کرے گا اُن کی ذمہ داری آپ پر بھی عائد ہو گی۔ آپ بھی اس کے ثواب یا عذاب میں شریک ہوں گے۔

۲۔ اس معاملے میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ شخصی معاملات میں کوئی غلطی بھی ہو جائے تو اس کا اثر بھی شخصی اور محدود ہوتا ہے، ثواب و عذاب بھی محدود۔ قومی اور ملکی معاملات سے پوری قوم متاثر ہوتی ہے، اس کا ادنیٰ نقصان بھی بعض اوقات پوری قوم کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے، اس لیے اس کا ثواب و عذاب بھی بہت بڑا ہے۔

۳۔ سچی شہادت کا چھپانا از روے قرآن حرام ہے۔ آپ کے حلقۂ انتخاب میں اگر کوئی صحیح نظریے کا حامل و دیانت دار نمائندہ کھڑا ہے، تو اس کو ووٹ دینے میں کوتاہی کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

۴۔ جو اُمیدوار نظامِ اسلامی کے خلاف کوئی نظریہ رکھتا ہے، اس کو ووٹ دینا ایک جھوٹی شہادت ہے جو گناہِ کبیرہ ہے۔

۵۔ ووٹ کو پیسوں کے معاوضے میں دینا بدترین قسم کی رشوت ہے اور چند ٹکوں کی خاطر اسلام اور ملک سے بغاوت ہے۔ دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لیے اپنا دین قربان کر دینا کتنے ہی مال و دولت کے بدلے میں ہو، کوئی دانش مندی نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ ''وہ شخص سب سے زیادہ خسارے میں ہے جو دوسرے کی دنیا کے لیے اپنا دین کھو بیٹھے''۔ (از مفتی اعظم مولانا محمد شفیع رحمہ اللہ، جواہر الفقہ)

# ضمیمہ

## مکمل تقریظات و تاثرات

## از جید علمائے کرام، مذہبی قائدین و دانشورانِ ملت

تقریظ

# حضرت مولانا سمیع الحق صاحب

مہتمم جامعہ دارالعلوم حقانیہ، امیر جمعیت علماء اسلام (س) پاکستان

جمہوریت عصر حاضر میں رائج سیاسی نظام ہے۔ پوری دنیا کی ریاستیں جمہوریت کے سانچے میں ڈھلتی جارہی ہیں، حتی کہ اسلامی ممالک بھی اس کو قبول کرتے جارہے ہیں۔ اکابرین امت نے پاکستان میں بھی جمہوری نظام کو قبول کیا تھا اور دستور کو اسلامیانے کرنے کیلئے طویل جدوجہد فرمائی، راقم خود اور والد ماجد شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق رحمہ اللہ بھی سالہا سال تک اس جدوجہد کا حصہ رہے۔

مجھے جمہوری نظام کے دعویداروں سے ہمیشہ ایک ہی شکوہ رہا ہے کہ جب عالم اسلام کی جید نمائندہ جماعتیں اور اسلامی ممالک کے عوام جمہوری طریقہ سے اپنے نظام بدلنے کا فیصلہ کردیتے ہیں تو اسلام دشمن اندرونی وبیرونی قوتیں اس جمہوریت کو سبوتاژ کردیتی ہیں اور ان پر آمریت مسلط کردیتی ہیں، مجبوراً عوام کو متبادل طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں تو مخالفین اسے دہشت گردی اور تشدد پسندی کا نام دے دیتے ہیں اور اس جدوجہد کو جمہوریت دشمنی قرار دے دیا جاتا ہے۔

ایسے حالات میں جمہوریت کے اصل دشمن کون ہیں؟ اگرچہ پاکستان میں یہ تجربہ تھوڑا مختلف رہا مگر نتائج کے لحاظ سے صفر رہا۔

زیر نظر کتاب "اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان" میں بہت سے سلگتے سوالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، نیز آئین پاکستان کے حوالے سے بہت سے خدشات کا ازالہ بھی کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے نہایت عزیز شاگرد مولانا محمد اسرار مدنی کی یہ کاوش نہایت قابل تحسین ہے۔

ضرورت ہے کہ ہمارے علماء اور فضلاء وقت کے ایسے اہم موضوعات پر محنت فرمائیں۔

تقریظ

# حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب

امیر جمعیت علما اسلام (ف) پاکستان

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے، اس لئے آزادی اس کی فطرت میں ہے۔ ہمارے اکابر نے اسی آزادی کے حصول کیلئے برطانوی استعمار سے جہاد کیا، اور جہاد کے دور ثانی میں ایک جمہوری اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے آزادی حاصل کی۔ اکابر امت نے انہیں سیاسی اور جمہوری اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلامیہ جمہوریہ پاکستان کی بنیاد رکھی جبکہ علماء امت نے نظریہ پاکستان کے تناظر میں اس کی اسلامیانے کیلئے طویل جدوجہد کی، اور بالآخر والد ماجد حضرت مفتی محمودؒ سمیت تمام اکابرین نے سن 1973 میں متفقہ آئین منظور کرایا. آئین کے مقدمے میں اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ مملکت اپنے اختیارات و اقتدار کو جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی جسمیں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں پر، جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پر پوری طرح عمل کیا جائے گا، دستور میں بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائیگی اور ان حقوق میں قانون، اخلاق عامہ کے تابع حیثیت اور مواقع میں مساوات، قانون کی نظر میں برابری، معاشرتی، معاشی اور سیاسی انصاف اور اظہار خیال، عقیدہ، دین، عبادت اور اجتماع کی آزادی ہوگی۔ دستور وآئین میں اتنی صاف اور واضح رہنمائی کے باوجود بعض سادہ لوح صرف یہ نعرہ لگاتے رہے کہ قرآن و سنت کے ہوتے ہوئے کسی اور دستور کی ضرورت نہیں. اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن حکیم اصل الاصول اور سنت تشریعی حیثیت کی حامل ہے تاہم اگر مصادر شریعت پر غور کیا جائے تو بات مزید منقح

ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کے مقابلے میں دستور کو وضع نہیں کیا جاتا بلکہ پاکستان میں اس کا منبع قرآن مجید ہی ہے، یہ ایسا ہے کہ کسی بجلی گھر سے برقی قوت حاصل کرکے کوئی قمقمہ روشن کیا جائے، قرارداد مقاصد نے دستور پاکستان کا قبلہ متعین کیا ہے. یہ ساری جدوجہد پارلیمنٹ میں ہوئی، میرا موقف ابتدا سے یہی رہا کہ پاکستان میں اسلامائزیشن سمیت کسی بھی سیاسی اور سماجی تبدیلی لانے کیلئے پارلیمنٹ سے مؤثر ادارہ ہے۔ زیر نظر کتاب میں پاکستان کے جمہوری نظام اور دستور کے حوالے سے چند اہم سوالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہےاور روایتی جذباتی اسلوب سے ہٹ کر علمی لہجے میں مدلل بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض مسائل میں قرآن وسنت اور فقہی و قانونی ذخیرے سے استدلال کیا گیا ہے، جس سے فکر و نظر کے نئے دریچے کھل جاتے ہیں، گویا پاکستان اور اس کے آئین کو شریعت اسلامیہ اور عالمی تناظر میں سمجھانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

میں اس کاوش پر عزیزم محمد اسرار مدنی اور ان کے رفقاء کار مولانا تحمید جان وغیرہ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں. نیز اپنے نوجوان علماء کرام، محققین اور دانشور حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جمہوری نظام کی بہتری کیلئے ملک و قوم کی رہنمائی کریں. خصوصا تعلیمی اداروں، مدارس، سکولز، کالجز اور یونیورسٹیز میں آگہی کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ مجلس تحقیقات اسلامی کی یہ کاوش آئین پاکستان، اور جمہوری نظام کے حوالے سے بہت سارے غلط فہمیوں کا ازالہ کرے گی اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے حوالے سے جاری مثبت اور تعمیری مکالمے میں کردار ادا کریگا۔

تقریظ

# پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب

چیئر مین اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

جمہوریت عصر حاضر میں انتقال اقتدار، طاقت کے توازن اور ریاست میں عدل وانصاف کے حوالے سے مناسب ترین نظام سیاست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی آزادی کے وقت جمہوریت کا انتخاب کیا گیا۔ تمام مکاتب فکر کے جید علما کرام، دانشوروں اور سیاسی قائدین نے اسے قبول کیا۔ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے وژن کے مطابق ''اسلامی دستور'' کا خاکہ مرتب کیا گیا جسے ۱۹۷۳ کے متفقہ آئین کی صورت میں عملی جامعہ پہنایا گیا۔ اس متفقہ آئین میں قرارداد مقاصد کو آئین کا باقاعدہ حصہ بنایا گیا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل سمیت دیگر امور انجام دیئے گئے۔ آئین پاکستان میں وقتاً فوقتاً اہم ترامیم ہوتی رہیں۔ جس کا واضح مطلب ہے کہ جمہوریت میں قوانین کو اسلامیانے کے عمل کے لئے قابل عمل طریقہ کار موجود ہے۔ عرصہ دراز سے پاکستان کے جمہوری نظام کی بعض خامیوں کی وجہ سے نظم مملکت کے بارے میں متعدد سوالات اٹھنے کے بعد پاکستان، جمہوریت اور دستور پاکستان پر کچھ عناصر مذہبی بنیادوں پر متعدد اشکالات پیش کر رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ان سوالات کا انتہائی مدلل انداز میں جامع جواب فراہم کیا گیا ہے۔ نیز آئین پاکستان کے حوالے سے شبہات کا بہترین ازالہ کیا گیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ محمد اسرار مدنی کی یہ کاوش اس موضوع پر مکالمے کی روایت کو آگے بڑھائے گی اور اس کے نتیجے میں قومی بیانیے کو فروغ دینے کی مساعی میں معاون ثابت ہو گی۔ ان شاءاللہ

تقریظ

# سینیٹر پروفیسر علامہ ساجد میر صاحب

امیر مرکزیہ جمعیت اہل حدیث پاکستان

مجلس تحقیقات اسلامی کی طرف سے تیار کردہ کتاب "اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان" کمپوز مسودہ کی صورت موصول ہوئی، جستہ جستہ پڑھی۔ بعض اہم اشکالات پر بحثیں تفصیل سے دیکھیں۔ یہ کتاب "جمہوریت اور پاکستانی آئین" کے بارے میں بعض حلقوں کی طرف سے پیدا کردہ غلط فہمیوں کو خوبصورت پیرائے میں دور کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کو جس طرح اسلام کے مد مقابل یا متضاد نظریہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور مملکت خداداد پاکستان میں "شجر ممنوعہ" قرار دینے اور کفر تک پہنچانے کی کوششیں کی جاتی ہیں' وہ قرین حقیقت' بالکل نہیں۔

بر صغیر پاک وہند کے اکابر اسلام ہر دور میں جمہوری انتخابات اور جمہوری تحریکوں میں شریک رہے ہیں۔ بالخصوص پاکستان میں جبکہ "متفقہ قرار داد مقاصد" آئین میں شامل بلکہ اساس کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور "قرآن وسنت" کو بالاتر قرار دیا جا چکا ہے تو اب پاکستان کے جمہوری پراسس کو کفر قرار دینا عبث اور نادانی ہی ہو گا۔

مجلس تحقیقات اسلامی نے اس کتاب کے ذریعے بہت سے اعتراضات واشکالات کو دور کرنے کا سامان کیا ہے اور ان عناصر کے لیے جو پاکستان کے جمہوری نظام اور پاکستان کے آئین کو بنیاد بنا کر (دانستگی یا نادانستگی میں) "تکفیری ماحول" پیدا کر رہے ہیں' افہام و تفہیم اور اصلاح احوال

کا وافر مواد فراہم کر دیا ہے۔ پھر بھی ابھی کرنے کا کافی کام باقی ہے۔ بالخصوص "نظام خلافت" کو "جمہوریت" کے منافی یا متضاد قرار دینے اور "خلیفہ" کی نامزدگی اور طریق انتخاب کے حوالے سے پھیلائے گئے شکوک وشبہات کی مزید توضیح ضروری ہے۔ اسی طرح "اکثریت یا اقلیت" کے معیار حق ہونے اور عالم وجاہل کی "برابری" کے معاملے میں بھی مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔ نیز "مسئلہ تکفیر" پر مزید تفصیل چاہیے۔

بہر حال! یہ ایک اچھی کاوش ہے اور ضرورت ہے کہ اس کو عام کیا جائے۔

تقریظ

# علامہ پیر اعجاز احمد ہاشمی صاحب

صدر جمعیت علمائے پاکستان

زیر نظر کتاب "اسلام، جمہوریت اور آئینِ پاکستان" کا مسودہ ملا، مجھے اس کے مطالعہ کا موقع ملا جس میں محترم اسرار مدنی صاحب نے محنت شاقہ سے اسلام دشمن گروہوں کے نہ صرف سوالات کے شافی جواب دیے بلکہ ان کے پیدا کردہ مغالطوں کو بھی اپنے نوک قلم سے رد کرتے ہوئے اسلامی اقدار و روایات کا تحفظ کرنے کا فریضہ سرانجام دیا۔

مملکت خداداد پاکستان جو اسلام کے نفاذ کے لئے حاصل کی گئی، جس کے لئے ہمارے بزرگوں نے تحریک چلائی اور قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ جیسا تجربہ کار وکیل قیادت کے لئے آگے بڑھا تو علماء مشائخ نے ان کا ساتھ دیا۔ پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری، پیر صاحب زکوڑی شریف، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا عبدالعلیم صدیقی سجادہ نشین کچھوچھہ شریف غرضیکہ علما کرام و مشائخ عظام نے متفقہ طور پر ان کی قیادت میں جدوجہد کی بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ اعلان سنی کانفرنس بنا، اس میں کہا گیا کہ اگر محمد علی جناح مطالبہ پاکستان سے دستبردار ہو جائیں تو اہل سنت پاکستان بنا کر دم لیں گے، یہ تحریک جمہوری انداز میں چلائی گئی، جلسے جلوس اور ریلیاں، کانفرنسز منعقد ہوئیں اور بالآخر فرنگی سامراج کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور جمہوری تحریکیں کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان معرض وجود میں آگیا۔

اب اس کے لئے دستور کا مسئلہ درپیش تھا، اس میں بھی علما کرام کے نکات رہنما اصول ثابت ہوئے۔ ۱۹۷۳ء کا دستور پارلیمنٹ کے اندر مذہبی وسیاسی جماعتوں کی کاوشوں کا نتیجہ تھا اس پر مذہبی رہنماؤں نے دستخط ثبت کئے۔ جمہوری انداز میں پارلیمنٹ کے ذریعہ مملکت کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھ دیا گیا۔ اسلام کو سرکاری طور پر مملکت کا مذہب قرار دیا گیا۔ مسلمان کی تعریف شامل ہوئی، اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ دس سال کے اندر تمام قوانین کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کا وعدہ ہوا۔ تو یہ ساری تگ ودو جمہوری انداز میں جمہوری اداروں کے ذریعہ کی گئی۔

مغربی جمہوریت میں پارلیمنٹ ہر قانون بنانے کا اختیار رکھتی ہے مگر اسلامی مملکت کے اندر ان کی حاکمیت کے بعد قانون اللہ رب العزت اور اس کے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کے مطابق ہوئے ہیں۔ جو اس دائرے سے باہر نکلتا ہے اس کا اسلام سے تعلق باقی نہیں رہتا۔ آج جس پر سب سے زیادہ تنقید ہوئی ہے اور مغرب اسے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتا ہے وہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا ہے۔ اس کو بھی نظر عمیق سے دیکھا جائے تو کیا یہ پارلیمنٹ کا فیصلہ نہیں ہے اور اس فیصلہ کے وقت قادیانی گروہ کے مؤقف کو پارلیمنٹ میں سن کر ہی مولانا شاہ احمد نورانی کی پیش کردہ قرارداد پر فیصلہ ہوا یہ سب جمہوری عمل کا نتیجہ ہے۔ مغرب میں پریس اسلام کو جس طرح پیش کرتا ہے اس سے غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں، مگر جب وہاں کے لوگ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی برکات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، یہی وجہ ہے اب مغرب میں لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہو رہے ہیں اور اس بات کو تسلیم کیا گیا کہ مغرب میں سب سے زیادہ پھیلنے والا دین اسلام ہے۔

مغرب کی چالاکیوں اور اسلام پر حملوں کے باوجود اسلام کا پھیلنا جہاں اس دین کی صداقت کی دلیل ہے وہاں اسلام قبول کرنے والے مغربی استعمار کے منہ پر طمانچہ رسید کر رہے ہیں اور ان کے جھوٹے پروپیگنڈے کو رد کر رہے ہیں۔

اسلام میں خلیفہ کو منتخب کیا جاتا ہے۔ منتخب کو ہی صدیق کہتے ہیں اور جو مسلط ہو اسے یزید کہتے ہیں، خلفائے راشدین نے اس وقت بیعت کا طریقہ اختیار کیا۔ اور آج بیعت کی جگہ ووٹ نے لے لی ہے۔ مگر اس نظام اور اب میں لوگوں کی رائے کا احترام بہر حال باقی ہے۔ اور اس کی اہمیت کو ہی اساس مقرر کیا گیا ہے۔ مغربی نظام میں صدر یا وزیر اعظم کرپشن کے باوجود عہدوں پر براجمان رہتے ہیں عوام کو مطمئن نہیں کرتے۔ ان کے سوالوں کے جواب نہیں دیتے مگر اسلام میں خلیفہ وقت کو بوڑھی عورت یہ کہتی ہے کہ اگر عمرؓ کو بھی میری تکلیف کا پتہ نہیں تو اسے حکومت کا حق حاصل نہیں۔ اور خلیفہ وقت راتوں کو گھروں کے باہر پہرہ دیتے ہیں، خاتون درد زہ سے کراہ رہی تھی تو حضرت عمرؓ اپنی بیوی کو تیماردار کی حیثیت سے لے جاتے ہیں تاکہ وہ اس مصیبت کی گھڑی میں اس کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے سکے۔

امیر المومنین صدیق اکبرؓ کے بعد حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا کہ کوئی ایسا کام تو نہیں جو مجھ سے رہ گیا ہوا اور حضرت صدیق اکبرؓ کرتے ہوں۔ کسی نے کہا کہ وہ عصر کے بعد شہر سے باہر جاتے تھے، آپ نہیں جاتے تو آپ بتائے ہوئے راستے پر گئے، دیکھا ایک وادی میں ایک بیمار ہے، کوڑھ کا مریض ہے۔ آپ نے دیکھا تو فوراً گھر آئے اس کی خوراک کا بندوبست کیا، واپس گئے تو اس کے منہ میں چمچ سے دلیہ ڈالا تو وہ مریض جو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا گرم دلیہ کی وجہ سے اس کا منہ برداشت نہ کر سکا تو اس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے خلیفہ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا آپ کو کیسے معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ جب وہ دلیہ کھلاتے تھے تو پہلے اپنے منہ میں ڈال کر اس کی حدت

کے کم ہونے پر میرے منہ میں ڈالتے تھے۔آج کے دلیے جو زیادہ گرم ہے اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ حضرت صدیقؓ کی بجائے آنے والا کوئی اور ہے۔

یہ خلافت علی منہاج النبوی ہے ،اسی راستے پر چلنے کا حکم دیا گیا ،اسلام کے نام لیوا اگر خدانخواستہ اس راستہ پر عمل نہ کریں تو اس سے قانون ختم نہیں ہوتا اور قیامت کے دن سب سے پہلے حقوق العباد کے بارے میں پوچھ گچھ ہو گی۔

زیر نظر کتاب اس دور میں اسلام کے نظام کا نقارہ ہے ، لوگ اس استفادہ کریں گے اور مغرب میں بیٹھ کر تنقید کرنے والوں کے سامنے اسلام کا اصلی چہرہ دیکھنے میں معاون ثابت ہو گی۔

مغربی جمہوریت کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مگر اس کے مقابلے میں اسلام تقوی، طہارت، اعلی اقدار کو بطور نمونہ پیش کر کے انسانیت کو اعلی راستے پر فائز کرتا ہے۔اسلام میں فلاح کو پیش نظر رکھا جاتا ہے جیسا کہ رفاہ عامہ کو بھی خدمت کے جذبے سے سر شار ہو کر ادا کیا جاتا ہے۔جناب اسرار مدنی صاحب نے مغربی نظریات کے افراد کو جھنجھوڑا ہے تو وہاں دین اسلام کے نام لیواؤں کو بھی اپنا ماضی یاد کرایا ہے تاکہ وہ اس کی روشنی میں مستقبل کی زلفیں سنوار سکیں۔

انہوں نے اسلام میں جمہوریت اور عام آدمی کی رائے کی اہمیت کو اجاگر کر کے بتایا ہے کہ ہر رائے قابل ہے، اچھی بات کی قدر کرنا چاہیے اور اس پر عمل کر کے ہی فلاح دارین حاصل کی جاتی ہے، ہمیں تو فی الدنیا حسنۃ فی الاخرۃ حسنہ کا سبق دیا گیا جسے ہم پڑھتے تو ہیں لیکن عمل پیرا نہیں ہوتے۔

تقریظ

# علامہ ثاقب اکبر صاحب

سربراہ البصیرہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ڈپٹی سیکرٹری جنرل ملی یکجہتی کونسل پاکستان

"اسلام، جمہوریت اور آئینِ پاکستان" کے عنوان سے جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے چند اہم عصری، سماجی اور سیاسی مسائل کی اصل پس منظر میں تفہیم کے لیے تحریر کی گئی ہے۔ دنیا میں سیاسی حوالے سے آئینی حکومتوں کی تشکیل کے آغاز سے لے کر آج تک مسلمان معاشروں میں بعض ایسے گروہ موجود ہیں جو تاریخ کے کسی خاص موڑ پر کھڑے رہ گئے ہیں اور وقت کے دھارے کے ساتھ ساتھ انھوں نے آگے سفر نہیں کیا۔ یہ کتاب دراصل ایسے افراد کا ہاتھ پکڑ کر انھیں تاریخ کی موجودہ شاہراہ پر لانے کی ایک کوشش سے عبارت ہے۔ اس میں ماضی کی اصطلاحوں میں چھپے ہوئے بعض سیاسی اور مذہبی مفاہیم کی عصری اصطلاحوں سے مطابقت کو تلاش اور بیان کرنے کے لیے بڑی محنت کی گئی ہے۔ فکری جمود کبھی معاشرتی زوال کا باعث بنتا ہے اور کبھی شدت پسندی کا روپ دھار لیتا ہے۔ آج اسلامی معاشروں میں اس حقیقت کے مظاہر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یقیناً بہت سے افراد ایسے ہیں جو اس طرز فکر اور اسلوب فہم سے متاثر تو ہیں لیکن اگر دلیل و برہان سے ان کی راہنمائی کی جائے تو وہ اسلامی معاشرے کے لیے مفید عنصر کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ صدر اول اسلام کے حکومتی مسائل کی تطبیق و تعبیر اس فکر و فہم کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ پیش نظر تالیف اسی مقصد کے حصول کے درپے ہے لہٰذا اس کے لیے مواد کا انتخاب اسی پس منظر میں کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ہم برادران گرامی قدر جناب مولانا محمد اسرار مدنی اور جناب مولانا محمد جان اخونزادہ اور ان کے معاونین کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

یہاں یہ امر جاننا ضروری ہے کہ خاندانی اور انفرادی ملوکیت و آمریت کے بجائے آئینی حکومتوں کا قیام انسانی معاشرے کی ایک بہت بڑی پیش رفت ہے جسے عصر حاضر میں بیشتر قوموں نے ایک انسانی قدر کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہے۔اسلامی تاریخ اور تعلیمات میں موجود خیر کے پہلوؤں سے دور حاضر میں استفادہ کے لیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ہماری دینی قیادت معاشرتی امور کو مقاصد شریعت اور اصول فقہ کی اصل الاصول اصالۃ الاباحہ کی روشنی میں جانچے۔ البتہ یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ اصطلاحوں پر اصرار ہماری ایک مشکل ہے اگرچہ ہمیں لفظ کے بجائے مفہوم اور معنی پر اصرار کرنا چاہیے مثلاً قرآن و سنت میں "شوریٰ" کا کلمہ استعمال ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ لفظ لغوی پہلو سے بڑھ کر مسلمانوں کے سیاسی ادب میں اصطلاح کی شکل اختیار کر گیا۔ ہمیں آج کے دور میں اس کے لیے متبادل اصطلاحوں یا کلمات کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام چونکہ ایک آفاقی، دائمی اور سرمدی دین ہے اس لیے اس نے اصولوں اور کلیات کے سہارے پیش رفت کا داخلی نظام وضع کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دین ہر دور، ہر معاشرے اور ہر فرد کے لیے قابل عمل ہے۔ اسلام نے انسانی معاشرے کی بیشتر جزئیات کو بدلتے حالات و شرائط کی روشنی میں حل کرنے کے لیے راہنمائی کی ہے۔ اگر ہم حقیقت دین کو اختیار کیے رکھیں تو ہمارا معاشرہ داخلی طور پر جمود اور حکومتی سطح پر استبداد کا شکار نہیں ہو سکتا۔ جزئیات کو ماضی میں تلاش کرنا اپنے تئیں بھول بھلیوں میں ڈالنے کے مترادف ہے لیکن شاید گاہے یہ کام ضروری ہو جاتا ہے، یہی ضرورت "اسلام، جمہوریت اور دستور پاکستان" کے مرتبین کو بھی درپیش ہے۔ انھوں نے معاصر افکار کی تطبیق و توجیہ کے لیے تاریخ اور ماضی کے مذہبی ادب سے جو استشہادات پیش کیے ہیں وہ ہمارے دور کے ایک گروہ کی مذہبی ذہنی ساخت کے پیش نظر ہیں کہ شاید اس طرح سے اس کی مشکل حل ہو جائے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ مرتبین کے مقصد کو سامنے رکھا جائے اور مثالوں میں مناقشہ نہ کیا جائے تو جذبہ اصلاح سے سرشار تمام افراد ہماری طرح ان کی زحمات پر انھیں قدر دانی کا مستحق قرار دیں گے۔

تقریظ

# جناب حامد میر صاحب

کالم نگار روزنامہ جنگ واینکر جیوٹی وی

اسلام اور جمہوریت کے موضوع پر بہت لکھا جاچکا ہے لیکن محترم محمد اسرار مدنی صاحب نے اسلام اور جمہوریت کے تعلق کو پاکستان کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر قائم کیا گیا اور یہ ملک جمہوری جدوجہد کا نتیجہ ہے لہذا "اسلام، جمہوریت اور آئینِ پاکستان" کے عنوان سے اس کتاب میں کچھ اہم سوالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں پاکستان کے تصور کے خالق ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے کچھ اشعار کے حوالے سے پھیلائی گئی غلط فہمیوں کو بھی دور کرنے کی موثر کوشش کی گئی ہے۔ جمہوریت کے مخالفین کہتے ہیں کہ اقبالؒ نے کہا تھا:

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام

چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر

صاف نظر آرہا ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ جمہوریت کے نہیں بلکہ مغربی جمہوریت کے ناقد تھے، انہوں نے ایک دفعہ خود پنجاب اسمبلی کا الیکشن لڑا تھا اور اس جمہوریت میں موجود کچھ خامیوں کا اندازہ ہوا، لہذا نومبر 1929 میں انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اپنے خطبے میں روحانی جمہوریت کی بات کی۔ ڈاکٹر محمد اقبالؒ ایک ایسے جمہوری نظام کے حامی تھے جس میں پارلیمنٹ کے ذریعہ اجتہاد بھی کیا جاسکے۔ اجتہاد صرف وہی کر سکتا ہے جسے دینی علوم پر دسترس حاصل ہو، لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ پڑھے لکھے لوگوں کی پارلیمنٹ پر یقین رکھتے تھے۔ پاکستان کا آئین

اسلامی بھی ہے اور جمہوری بھی ہے، لیکن کچھ لوگ اس آئین کو غیر اسلامی کہتے ہیں۔ پاکستان کے آئین میں بہتری کی گنجائش موجود ہے، اس آئین پر اسکی روح کے مطابق عمل کیا جائے تو آئین پر اعتراضات کرنے والوں کو خاموش کروانا بہت آسان ہے۔ علما کی بڑی اکثریت بادشاہت اور آمریت کو اسلام کی ضد سمجھتی ہے۔ جمہوریت اسلام کے قریب ترین ہے۔ قرآن مجید کی سورہ شوریٰ میں مشورے کا ذکر ہے۔

پارلیمنٹ صلاح مشورے کا ارادہ ہے جہاں اکثریت رائے سے قانون سازی کی جاسکتی ہے۔ قرآن پاک نے کچھ اصول بنائے ہیں نظام حکومت بنا کر نہیں دیا۔ کچھ معاملات پر قرآن مجید کی خاموشی کو علمانے ''سکوت حکیمانہ'' قرار دیا ہے تاکہ مسلمان بدلتے ہوئے حالات میں باہمی صلاح مشورے کے ساتھ اپنے معاملات کو خود بہتر بناتے رہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے فکر کی نئی راہیں کھلیں گی اور ہمیں اپنے سیاسی نظام میں موجود خامیوں کو سمجھنے کے علاوہ انہیں دور کرنے کا ادراک بھی پیدا ہو گا۔ بقول اقبالؒ ''جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' پاکستان کے آئین پر عمل درآمد حکمرانوں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ آئین پر عمل درآمد کریں۔ آئین میں اسلام کے نفاذ کے راستے موجود ہیں۔ آئین اور جمہوریت کو غیر اسلامی قرار دے کر ریاست سے محاذآرائی کرنے کی بجائے جمہوری انداز میں آئین پر عمل درآمد کرانے کی کوشش کی جائے تو اسلام اور پاکستان دونوں کا بھلا ہو گا۔

تقریظ

# حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب

ڈائریکٹر الشریعۃ اکادمی گوجرانوالہ

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے یثرب کو اپنی قیام گاہ بنایا تو تھوڑے عرصہ میں ہی وہاں ایک ریاست وحکومت وجود میں آ گئی، جس کا مرکز مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ اس ریاست وحکومت کو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی کا اعزاز حاصل تھا، جبکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت میں اس ریاست وحکومت نے صرف دس برس میں پورے جزیرۃ العرب کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس ریاست وحکومت کی اساس جبر و تسلط پر نہیں بلکہ مفاہمت و مکالمہ پر تھی جو یثرب کے دو قبائل کے ساتھ ہجرت کے تین سال سے قبل جاری تھا اور بیعت عقبہ اولی اور بیعت عقبہ ثانیہ اسکے اہم مراحل تھے۔ پھر یثرب کے دیگر قبائل کے ساتھ جن میں یہود اور مشرکین شامل تھے، مذاکرات ومعاملات کے نتیجے میں ''میثاق مدینہ'' وجود میں آیا جو ریاست مدینہ کا دستور و قانون قرار پایا۔ اسی طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب ''خلافت'' کے نظام کا آغاز ہوا اور نظم خلافت نے جزیرۃ العرب کی اس ریاست وحکومت کو روم وایران اور افریقہ وایشیا کی وسعتوں تک پھیلا دیا تو اس خلافت کی بنیاد بھی خاندانی استحقاق یا عسکری قبضہ پر نہیں تھی بلکہ خلیفۂ اول کا انتخاب مدینہ منورہ کے مختلف قبائل اور گروہوں کے درمیان مذاکرات اور مکالمہ کے ذریعہ امت کی اجتماعی صوابدید کی اساس پر ہوا تھا۔

اس نظام میں شہریوں کو درجہ بدرجہ رائے دہن کے حق کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کے احتساب اور نقد وجرح کا حق بھی حاصل تھا اور وسیع تر ریاستی نظام نے ملت کے تمام طبقات، شعبوں اور دائروں کا احاطہ کر لیا تھا جبکہ اس ریاست وحکومت میں سوسائٹی کے نادار، ضرورت مند، معذور اور مستحق افراد و طبقات کی کفالت بھی اس کی ذمہ داریوں میں شامل تھی جس نے اسلامی ریاست کو ایک آئیڈیل ''ویلفیئر اسٹیٹ'' کی حیثیت دے دی تھی۔ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کے ان حکومتی و ریاستی دائروں اور اصولوں کو آج کے دور میں پیش کرنے کیلئے بعض حلقوں نے جدید سیاسی، معاشی اور سماجی اصطلاحات کا سہارا لیا تو اس سے اسلامی ریاست وحکومت کے خدوخال کے حوالہ سے کنفیوژن پیدا ہو گیا جسے شعوری یا لاشعوری طور پر بلاوجہ مسلسل پھیلایا جارہا ہے۔

اس پس منظر میں ریاست وحکومت کے مروجہ مفاہیم اور اسلامی حکومت وخلافت کے اصولوں، دائروں اور طریق کار کے بارے میں پیدا ہو جانے والے شکوک و شبہات کا ازالہ اور خلافت راشدہ کے اصولوں اور طریق کار کو اصلی شکل میں پیش کرنا اہل علم کی ذمہ داری اور مختلف ارباب فکر و دانش اس کیلئے مصروف عمل ہیں۔ ہمارے فاضل دوستوں جناب اسرار مدنی، تحمید جان اور ان کے رفقاء نے زیر نظر کتاب میں اسی کاوش کو آگے بڑھایا ہے اور متعلقہ امور و مسائل پر علمی و فکری انداز میں گفتگو کی ہے جو اس مسئلہ کو سمجھنے کیلئے کافی حد تک معاون ہو سکتی ہے۔

دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت اس محنت کو قبول فرمائیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کیلئے نفع بخش بنائیں۔ آمین

تقریظ

# جناب مجیب الرحمان شامی صاحب

چیف ایڈیٹر روزنامہ پاکستان، تجزیہ کار دنیا ٹی وی

مجلس تحقیقات اسلامی کی اس کاوش کی تعریف کی جانی چاہیے کہ اس نے جمہوری نظام اور پاکستان کے دستور کا ایک سنجیدہ جائزہ لینے کا اہتمام کیا ہے۔ زیر نظر کتاب کے کسی جز سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ آج کی پاکستانی سیاست اور صحافت کے مروجہ اسلوب سے حتی الامکان گریز کرتے ہوئے دلیل کے ساتھ بات کی گئی ہے۔ پڑھنے والوں کو اس سے بڑی رہنمائی ملے گی اور وہ اجتماعی عصری مسائل کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ اجتماعی زندگی کو نہ تو دعوؤں اور وعدوں سے منظّم کیا جا سکتا ہے نہ ہی تاریخی حوالے دے دے کر ہم اپنے آج کے مسائل کو چٹکیاں بجا کر حل کر سکتے ہیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد معاملات بہت پیچیدہ ہو چکے ہیں، ان کا سامنا کرنے کے لئے جدید و قدیم پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اجتہادی بصیرت سے کام لینے کے لئے اپنے فقہی سرمائے کے ساتھ ساتھ جدید سیاسیات اور معاشیات کا علم حاصل کرنا لازمی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ جمہوری نظام اور اس کے اصولوں پر سطحی بحث کے بجائے فکر انگیز سوالات اٹھائے گئے ہیں۔ سودی نظام پر غور کرتے ہوئے بھی یہ بات مد نظر رکھنا ہو گی کہ یہ پورے عالم اسلام کا مسئلہ ہے، کسی ایک ملک کا نہیں۔ الحمدللہ اس کے بارے میں پاکستان کے علمائے کرام نے مثبت اقدامات کئے ہیں اور ایسی ادارہ سازی میں مدد دی ہے، جو ایک نئے نظام کی بنیاد رکھ سکیں۔ غیر سودی بنکاری نے اپنے آپ کو منوایا ہے اور اب اسے کتابی بات کہہ کر نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ مجھے امید ہے کہ مجلس تحقیقات اسلامی عرق ریزی جاری رکھے گی اور پاکستانی معاشرے کو اسلامی اقدار سے ہم آہنگ کرنے میں اس کی مساعی (انشاء اللہ) ضرور بارآور ہوں گی۔

تقریظ

# جناب لیاقت بلوچ صاحب

سیکرٹری جنرل جماعت اسلامی پاکستان

"اسلام ، جمہوریت اور آئین پاکستان" کا مسودہ ملاحظہ ہوا، یہ اسلام دشمن قوتوں کے پھیلائے ہوئے بہت سارے مغالطوں کو رفع کرنے کا ایک مجرد نسخہ ہے۔ دین اور دنیا الگ الگ ہیں، سیاست اسلام سے الگ ہے۔ نیز جمہوریت کفر ہے اور اسلام میں انتخابات کا تصور ہی نہیں۔ اسی طرح کے اور بہت سارے مغالطے دانستہ طور پر اسلام کے خلاف پھیلائے گئے ہیں۔ عام مسلمان تو کجا، علماء تک ان مغالطوں کا شکار ہوئے ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ جس دین کی بنیادی تعلیم یہ ہو کہ ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے'' ۔اس کے ماننے والے یہ سمجھ بیٹھیں کی دنیا، دین سے الگ ہے یا یہ کہ اسلام اور سیاست ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ پھر جو ملک غالب مسلم اکثریت کے ساتھ " پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ "کے نعرے کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا ہو، وہاں اسلام اور جمہوریت کے حوالے سے سوالات کھڑے کر دئے جائیں۔

اسلام دشمنوں کا یہ زہریلا پروپیگنڈا اس لئے سرایت کر گیا کہ اسلام کے صدیوں کے انحطاط و تعطل نے ہمارے ذہنوں میں ''مغربی جمہوریت'' اور "اسلامی جمہوریت" کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔ ہمارے ذہنوں سے یہ تصور محو ہو کر رہ گیا ہے کہ "اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے"۔ کیونکہ ایک طویل عرصہ سے اسلام ہماری اجتماعی زندگیوں میں نہ رہا اور ہم دنیا پر اللہ کے باغیوں کے خود ساختہ نظاموں کے غلام بن کر رہ گئے۔ جن کا واحد ہدف انسان کی ''دنیا'' ہی تھا۔ وہ اسلام

کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں کو نہ صرف عملی طور پر اپنا غلام بنایا بلکہ علمی طور پر بھی مسخر کرنے کی کوشش کی۔ کوتاہ نظر مسلمان ان نظاموں کو ''سکہ رائج الوقت'' کے طور پر قبول کر بیٹھے۔ نتیجاً صدیوں کی اس روش نے مسلمانوں کو ذہنی طور پر بھی غلام ابن غلام بنا کر رکھ دیا۔

آج ہم اسلام کی جمہوری روایات کو بھول کر، جمہوریت کو محض مروجہ ''مغربی جمہوریت'' پر محمول کر لیتے ہیں اور اسلامی جمہوریت سے بد ظن ہو جاتے ہیں۔ جس طرح غیر مسلم، عام مسلمانوں کے رویوں کو دیکھ کر دین اسلام سے دور ہیں۔ اس میں قصور نہ اسلام کا ہے اور نہ ہی جمہوریت کا ہے۔ حالانکہ اسلام کے جمہوری مزاج کے حوالے سے خلافت راشدہ کے عملی نمونوں میں ہمارے لئے بھرپور رہنمائی موجود ہے لیکن ہم اسے از کار رفتہ قرار دے کر نظر انداز کئے ہوئے ہیں اور مجرد ''جمہوریت'' اور ''سیاست'' کو لے کر باہم دست و گریباں ہیں۔

خلافتِ راشدہ سے ہمیں اسلامی نظام حکومت کے لئے جو بنیادی تین اصول ملتے ہیں وہ اس کے قیام، اس کے طریقہ کار اور اس کو آگے منتقل کرنے کے متعلق ہیں۔ چاروں خلفائے راشدین کے تقرر سے ثابت ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی نامزدگی کے بعد اس وقت تک حلف نہیں لیا جب تک ہر مقام سے عام و خاص کی بیعت کی اطلاع نہیں آگئی۔ کیا آج کی ''مغربی جمہوریت'' اس اسلامی جمہوریت کا پرتو تک بھی پیش کر سکتی ہے۔ پھر بحیثیت حکمران چاروں خلفائے راشدین کا طرز حکومت جس طرح خوف خدا اور فکر آخرت کے عملی نمونے ہمارے سامنے رکھ رہا ہے، کیا موجودہ مروجہ مادہ پرستانہ ''مغربی جمہوریت'' پر اس کا شائبہ تک بھی کیا جاسکتا ہے! کیا آج انسانوں کے کشتوں کے پشتے لگانے والے بھیڑیئے، فرات کے کنارے ایک پیاسے کتے کے مرنے پر اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے بڑا اسلامی جمہوریت کا نمونہ

اور کیا پیش کیا جاسکتا ہے کہ بھرے مجمع میں حکمران کے لباس پر سوال اٹھتا ہے اور انہیں وضاحت کے لئے اپنے بیٹے کو پیش کرنا پڑتا ہے۔

خلافت راشدہ میں انتقال اقتدار کے جو نمونے موجود ہیں وہ آج کی موروثی جمہوریت کے منہ پر طمانچے سے کم نہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ موجود ہیں اور اکابر صحابہؓ میں سے ہیں۔ لیکن نامزدگی حضرت عمر فاروقؓ کی ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ موجود تھے اور یہ بھی اکابر صحابہ میں سے تھے۔ مگر نامزدگی حضرت عثمان غنیؓ کی ہوتی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ نے بھی اپنے کسی رشتہ دار کو نامزد نہیں کیا حالانکہ حضرت علیؓ کے دو بیٹے جو نواسہ رسولؐ بھی تھے ، موجود تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے تو انتقالِ اقتدار کے حوالے سے کمال کی مثال قائم کی ہے۔ باہر باغی محاصرہ کئے کھڑے ہیں اور یہ محاصرہ چالیس دن تک طویل ہوگیا ہے۔ ان باغیوں کا مطالبہ ،آپؓ کی اقتدار سے دستبرداری کا تھا۔ اکابر صحابہؓ ان باغیوں سے جنگ کی اجازت طلب کررہے تھے، لیکن آپ نے نہ جنگ کی اجازت دی اور نہ ہی دستبردار ہوئے بلکہ جام شہادت نوش کرنے کو ترجیح دی۔ ایک طرف خوف خدا لاحق تھا تو دوسری طرف فکر آخرت دامن گیر تھی، کیونکہ دستبرداری کا مطلب ان باغیوں کو اقتدار منتقل کرنا تھا اور جنگ کی اجازت امت میں خونریزی کا باعث بن سکتی تھی۔ یہ ہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق اقتدار کی امانت کی حفاظت اور اس کو منتقل کرنے کے نمونے۔

کتاب ''اسلام ، جمہوریت اور پاکستان'' اسلام کے بطور نظام حیات ،انحطاط و تنزل کے اس دور میں ایک نقارہ ہے اور امت مسلمہ کے لئے مینارہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمان اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت کے واضح فرق کو سمجھ لیں کہ مغربی جمہوریت کے تین بنیادی

اصول ''حکومت عوام کی، عوام کے لئے، عوام کے ذریعے'' کے مقابلہ میں اسلامی جمہوریت کی بنیاد '' اللہ کی حکومت، عوام کے لئے، عوام کے ذریعے'' ہیں۔ اسلام کا منشا اول و آخر ''اللہ کی حکومت'' کا ہی قیام ہے اور یہ خلفائے راشدین کی پیروی میں عوام ہی کے لئے ہو گی اور قائم بھی عوام ہی کے ذریعے ہو گی۔

اس کتاب میں ''حکومت عوام کے لئے'' یعنی رفاہ عامہ اور فلاح عامہ کے تناظر میں اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت کے مشترکہ اہداف کو اچھے انداز سے اجاگر کیا گیا ہے۔ پھر مروجہ مغربی لادین جمہوریت کی کلی تکفیر کی آڑ میں ،اسلام کے اندر جمہوری اقدار کی نفی کا بھی ایک اچھا محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔ دستور پاکستان ، مقنّنہ او راسلامی قوانین کی تیاری او ر نفاذ کے متعدد اداروں کے حوالے سے پھیلائے گئے مغالطوں کو بھرپور طریقے سے رفع کیا گیا ہے۔ آخر میں پاکستان کے اندر اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے ،اب تک اٹھائے گئے تدریجی اقدامات کی تفصیلات بھی شامل کی گئی ہیں، جن میں ۱۹۴۹ء کی ''قرارداد مقاصد'' اور ۱۹۵۱ء کے ۳۲ علماء کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ انہی دو بنیادی دستاویزات کی روشنی ہی میں بعد میں ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء آئین پاکستان مرتب و مدون ہوئے۔

محمد اسرار مدنی صاحب کی کتاب ''اسلام، جمہوریت اور پاکستان'' کا خیر مقدم کرتے ہوئے توقع ہے کہ عصر حاضر میں اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالے سے جو الجھنیں اور شبہات بعض مسلمانوں کے ذہنوں میں موجود ہیں، اس کتاب کے مطالعہ سے کافی حد تک ان کی تشفی ہو جائے گی۔

# فہرست مراجع


| نمبر شمار | کتاب کا نام | مصنف | ناشر / تنظیم |
|---|---|---|---|
| ۱ | خطبات صدارت | مولانا حسین احمد مدنیؒ | مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ |
| ۲ | متحدہ قومیت اور اسلام | مولانا حسین احمد مدنیؒ | جمیعہ پبلی کیشنز لاہور |
| ۳ | خطبات جمعیت علمائے ہند | ڈاکٹر شجاعت علی سندھلوی | طیب پبلشرز لاہور |
| ۴ | اسلام میں آزادی کا تصور | مولانا ابوالکلام آزادؒ | مکتبہ جمال اردو بازار لاہور |
| ۵ | مسئلہ خلافت | مولانا ابوالکلام آزادؒ | مکتبہ جمال اردو بازار لاہور |
| ۶ | شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک | مولانا عبید اللہ سندھیؒ | سندھ ساگر اکیڈمی لاہور |
| ۷ | رسولؐ کی حکمرانی اور جانشینی | ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ | بیکن بکس ملتان |
| ۸ | اسلام اور سیاسی نظریات | مولانا مفتی تقی عثمانی | مکتبہ معارف القرآن کراچی |
| ۹ | دین کی سیاسی تعبیر | مولانا وحید الدین خان | مکتبہ الرسالہ نئی دہلی انڈیا |
| ۱۰ | ارمغان شاہ ولی اللہ | پروفیسر محمد سرور | سندھ ساگر اکیڈمی لاہور |
| ۱۱ | تعبیر کی غلطی | مولانا وحید الدین خان | مکتبہ الرسالہ نئی دہلی انڈیا |
| ۱۲ | اسلام کا نظام حکومت | مولانا حامد الانصاری | الفیصل اردو بازار لاہور |
| ۱۳ | اسلامی حکمرانوں کے اوصاف واخلاق | مولانا عبدالباقی حقانی | موتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ |
| ۱۴ | اصول تکفیر | مفتی عبید الرحمن | مرکز البحوث الاسلامی مردان |
| ۱۵ | اسلامی ریاست (فلسفہ نظام کار اور اصول حکمرانی) | مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ | اسلامک پبلی کیشنز |

# آئین پاکستان اور اسلامائزیشن سے متعلقہ کتب

| نمبر شمار | کتاب کا نام | مصنف | ناشر / تنظیم |
|---|---|---|---|
| ۱ | پارلیمنٹ، دستور اور عدلیہ | پروفیسر خورشید احمد | منشورات، منصورہ ملتان روڈ لاہور |
| ۲ | جہاد مزاحمت اور بغاوت | ڈاکٹر مشتاق احمد | کتاب محل لاہور |
| ۳ | ماہنامہ الشریعہ (جہاد کلاسیکی و عصری تناظر میں) | مولانا عمار خان ناصر | الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ |
| ۴ | دہشتگردی ایک فکری مطالعہ | سلمان عابد | جمہوری پبلی کیشنز |
| ۵ | سوکس | اکیڈمک بک | پنجاب کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور |
| ۶ | ماہنامہ حق نوائے احتشام کراچی (دستور پاکستان نمبر) | مولانا تنویر الحق تھانوی | جامعہ احتشامیہ جیکب لائن کراچی |
| ۷ | ماہنامہ حق نوائے احتشام کراچی (پاکستان نمبر) | مولانا تنویر الحق تھانوی | جامعہ احتشامیہ جیکب لائن کراچی |
| ۸ | ماہنامہ ترجمان القرآن | پروفیسر خورشید احمد | البلاغ ٹرسٹ لاہور |
| ۹ | ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ | مولانا زاہد الراشدی | الشریعہ اکیڈمی گوجرانوالہ |
| ۱۰ | سہ ماہی تاریخ (شمارہ ۵۴) | ڈاکٹر مبارک علی | فکشن ہاؤس، لاہور، کراچی |
| ۱۱ | دساتیر پاکستان کی اسلامی دفعات | ڈاکٹر شہزاد اقبال شام | شریعہ اکیڈمی اسلام آباد |
| ۱۲ | اسلام اور جدید فکری مسائل | مولانا خالد سیف اللہ رحمانی | ھدی بک حیدرآباد انڈیا |
| ۱۳ | علم شہریت | محمد اسرار مدنی، محمد جان اخونزادہ | دی میڈیا فاونڈیشن لاہور |
| ۱۴ | تصحیح المفاھم | دکتور احمد الطیب شیخ الازھر | مجمع البحوث الاسلامیہ الازھر مصر |

# جمہوریت/آئین پاکستان کے متعلق تنقیدی کتب

| نمبر شمار | کتاب کا نام | مصنف | ناشر/تنظیم |
|---|---|---|---|
| ۱ | اسلام یا جمہوریت | دس مصنفین | کتاب محل لاہور |
| ۲ | خلافت و جمہوریت | مولانا عبدالرحمن کیلانی | مکتبہ السلام، وسن پورہ لاہور |
| ۳ | اسلام کا نظام سیاست و حکومت | مولانا عبدالباقی حقانی | مکتبہ حقانیہ |
| ۴ | جہاد اسلامی میں غنائم کی اقسام | ابو مخذورہ | تحریک طالبان پاکستان |
| ۵ | کیا ہمارا آئین اسلامی ہے؟ | مولانا نورالھدی | مکتبہ ربانیہ |
| ۶ | لال مسجد کی داستاں بزبان شہداو غازیان | حافظ عبدالرحمن غازی | تحریک طلبا و طالبات آزاد کشمیر |
| ۷ | الوثیقۃ السیاسیۃ | ڈاکٹر ایمن الظواہری | ادارۃ السحاب |
| ۸ | سپیدہ سحر یا ٹمٹماتا چراغ | ڈاکٹر ایمن الظواہری | ادارۃ السحاب |
| ۹ | دجال اور ظہور امام مہدیؑ | مولانا عاصم عمر | ادارۃ السحاب |
| ۱۰ | دین اسلام یا دین جمہوریت؟ | مولانا عاصم عمر | ادارۃ السحاب |
| ۱۱ | جمہوریت نظام کفر ہے | عبدالقدیم زلوم | حزب التحریر |

# یاداشت

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....